گھنے سائے
(کچھ خاکے، کچھ شخصی مضامین)
اسلم پرویز
www.kitaabistan.com

گھنے سائے

(کچھ خاکے، کچھ شخصی مضامین)

اسلم پرویز

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

اشاعت اول	:	مارچ ۲۰۱۰ء
تعداد	:	۵۰۰
بہ اہتمام	:	عبدالغنی
سرورق	:	خالد بن سہیل
لیزر ٹائپ سیٹنگ	:	اِنک گرافکس، 3961، اُردو بازار، دہلی۔
مطبع	:	اعلیٰ پرنٹنگ پریس، دہلی۔
قیمت	:	۲۰۰ روپے
ناشر	:	

دلی کتاب گھر

۳۹۶۱۔گلی خانخانان، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

GHANE SAYE (Kuchh Khake, Kuchh Shakhsi Mazameen)

ASLAM PARVEZ

PRICE : RS. 200/-

Dilli Kitab Ghar

3961-GALI KHANKHANAN, JAMA MASJID, DELHI-110006.

PHONE : 011-23252696 E-Mail : dillikitabghar@gmail.com

نیر مسعود کے نام

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

ترتیب

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

پیش لفظ

ان دیکھے زمانوں کے بارے میں جاننے کی خواہش ہر زمانے میں بہت عام رہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ بڑھتی بھی گئی ہے۔ ہر دن نئی نئی کتابیں نئے نئے زاویوں سے ایسی معلومات فراہم کرتی ہیں کہ نہ جانے کتنے بیتے ہوئے لمحے اور بھولی ہوئی، کھوئی ہوئی شخصیتیں اپنی صفات کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سب مرتب ہوکر ہماری تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ تاریخ کا فن اپنے اندر نہ جانے کتنے اور فن چھپائے رہتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے سامنے اپنے اسرار افشا کرتے رہتے ہیں اور زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار کو اس کی کبھی تند اور کبھی سست رفتار کے ذریعے عیاں کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہم جس عہد میں زندہ ہیں اور تمام عمر اس عہد کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں، اس کی رو میں جو کچھ آتا ہے اُسے خاموشی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اس کی پروا نہیں کرتے کہ وہ کون کون لوگ ہیں، کیسے کیسے واقعات اور حادثات ہیں، جو نہ صرف گزرے بلکہ جن میں ہم خود شریک رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم خود بہت سے واقعات کا سبب ہوتے ہیں۔ جسے ہم مانیں یا نہ مانیں، ہمارے

عہد کے دوسرے لوگ ضرور دیکھتے اور جانتے ہیں۔ گویا زندگی کا وہ پہلو جسے ہم عصر تاریخ کہا جاتا ہے اور جو ہمارے سامنے جیتی جاگتی موجود رہتی ہے ہم سے بے حد قریب ہونے کے باوجود ہمیں ہماری بے پروائی کی وجہ سے خود سے دور رکھتی ہے۔ گزرے ہوئے دنوں کی باتوں کو تو ہم ماضی کی تاریخ مان کر، لوگوں سے سُن کر یا کتابوں میں پڑھ کر جھوٹی سچی آدھی ادھوری جس شکل میں بھی پائیں، قبول کر لیتے ہیں مگر اپنی آنکھوں کے سامنے بننے والی اور گزرنے والی تاریخ کو بس آئے دن ہونے والے واقعات سمجھ کر گزر جانے دیتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زندگی کے سیماب پا لمحوں کو اس طرح چپ چاپ گزرنے نہیں دیتے۔ بلکہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان میں سے جتنا کچھ بھی اپنی گرفت میں لے سکتے ہوں، لے لیں اور دوسروں کو اس کی یادداشت کی لذت میں شریک کریں۔ زندگی کا یہ پہلو ہمارے سامنے سوانح، یادداشت، روزنامچے، مکاتیب، روداد اور رپورتاژ کی شکل میں آتا ہے۔ گویا یہ عصری تاریخ کی چشم دید شہادتوں کا خزانہ ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔

اسلم پرویز ہمارے ان جانے پہچانے دانشوروں میں ہیں جنھوں نے اپنے اس شوق کو کئی طرح سے پورا کیا ہے۔ 'اردو ادب' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی ادبی صحافت کے ذریعے ہر شمارے میں اپنے عہد کے بارے میں اطلاعات ثبت کرتے رہے ہیں، اپنے اداریوں اور اشارات اور اپنے منتخب کیے ہوئے رسالے کے مشمولات کے ذریعے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً وہ اپنے عہد کے ایسے اشخاص پر مضامین شایع کراتے رہے ہیں جنھوں نے انھیں یا اُن کے ہم عصروں کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کیا ہے۔ اشخاص کے بارے میں تاثر قائم کرنا سیدھی سادی بات نہیں ہے۔ یہ پیچیدہ عمل کئی راستوں سے آتا

ہے۔ ان اشخاص میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے ہم ملتے رہتے ہیں اور ملاقاتوں کی بنا پر ہمارے دل میں ان کے نرم گرم گوشے بن جاتے ہیں یا جو ہمارے عہد کی زندگی پر اپنے کارناموں کے ذریعے اثر ڈالتے رہے ہیں اور ہم پر اس عہد کے ایک عام شخص کی طرح ان کا ردِعمل ہوتا ہے۔ گویا انھوں نے خود ہمارے ذہن اور ہماری شخصیت کی تعمیر یا نشوونما میں حصہ لیا ہے۔ ان میں وہ سب لوگ ہیں جن کی ہنرمندیوں اور فن کاریوں نے اس عہد کی زندگی کو بنانے یا بگاڑنے میں حصہ لیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ذاتی طور پر ہم سے بہت دور ہوں، جن سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہ ہوا ہو یا جنھیں ہم نے مجلسوں، محفلوں یا اخباروں اور رسالوں کے صفحات پر دیکھا ہو اور اُن کے ذریعے ان کی شخصیت نے ہمیں کچھ اس طرح متاثر کیا ہو کہ ہم سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ان کی باتوں یا کاموں کے بارے میں سوچتے ہوں اور بسا اوقات اس شدت کے ساتھ سوچتے ہوں کہ ان کی بدولت ہماری سوجھ بوجھ پر اثر پڑا ہو۔ ہمارے رویّے میں فرق آیا ہو۔ مختلف معاملات کے بارے میں ہماری رائے بنانے میں انھوں نے حصہ لیا ہو۔ اسلم پرویز کی اس کتاب میں ایسے سب لوگ ملیں گے جنھوں نے مختلف زاویوں سے ذہن اور زندگی پر اپنی روشنی کی کچھ کرنیں ڈالی ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں مگر جن کے بارے میں ہم سب کی رائیں اور تجربات مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ اختلاف خود اپنے عہد کی زندگی کی رنگارنگی میں اضافہ کرتا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن سے مصنف کا نجی تعلق یا رشتہ رہا ہے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس عہد کے ہر شخص، کم از کم باشعور شخص کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کیا کہ وہ ان سے اپنے طور پر ایک خاص قرب محسوس کرتا ہے۔ ان کی تحریروں کے ذریعے بھی اور خبروں اور افواہوں کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور ان واقعات کے اثرات کے طور پر بھی ہو سکتا ہے

جن کے وارد ہونے میں اُن کے کارناموں، سرگرمیوں، یا حکمت عملی کا اثر ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں چچی، استاد رسا، ظ انصاری، خلیق انجم کے بارے میں مضامین میں بے تکلفی کی جو نوعیت ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد، آنند نرائن ملاّ وغیرہ کے بارے میں مضامین میں نہیں کہ یہ اس عہد کی وہ شخصیتیں ہیں جن تک مصنف کی شخصی رسائی ان کی تحریروں کے ذریعے ہوتی ہو اور اسی اعتبار سے اس کتاب کے مضامین میں مصنف کے اسلوب میں بھی ایک تنوع اور رنگارنگی ہے۔ کہیں انھوں نے پردے ہٹا دیے ہیں یا ان پر ایسے نقش و نگار اُبھارے ہیں کہ وہ اور ان کے ممدوح دونوں کے درمیان فاصلے کا وہم بھی ختم ہوگیا ہے اور کہیں احترام، علم و فضل کا رعب اور خود اپنی ذات کے بارے میں رائے زنی نے فاصلہ نہ صرف بڑھا دیا ہے بلکہ اس کو اتنا پراسرار بنا دیا ہے کہ پڑھنے والے اس لیے اثر لیتے ہیں کہ وہ خود بھی ان باعظمت شخصیتوں سے اسی قسم کی دوری کی بنا پر ایک ایسا پُراسرار قرب محسوس کرتے ہوں جو فاصلے نے اس لیے جنم دیا ہے کہ اس نے خاموش جذباتی اور قلمی رشتے میں ایک شدت پیدا کردی ہے جیسے آنند نرائن ملاّ، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ اس طرح کے مضامین کو خاکہ کہنا ناانصافی بلکہ زیادتی ہوگی۔

خاکہ نگاری کا رواج ہمارے ہاں بہت پرانا ہے۔ مکتوبات، داستانیں، افسانے، سفرنامے، سوانح اور یادداشتیں، روزنامچے وغیرہ خاکوں سے ہمیشہ مزین رہے ہیں مگر خاکہ نگاری ایک صنفِ ادب کے طور پر پہلے نہیں تھی۔ اسے بیسویں صدی میں فروغ ہوا اور ہمارے ہاں بڑے اچھے خاکہ نگار ہوئے جنہوں نے خاکہ لکھ کر اپنے ممدوح کو اس طرح جیتا جاگتا ہمارے سامنے پیش کیا کہ وہ لوگ بھی جو اُن سے واقف نہیں تھے، اُن کے گرویدہ ہوگئے۔

اسلم پرویز کا اسلوب اُن کی اپنی شخصیت کے بعض اوصاف کو دوسروں کی ذات

میں کچھ اس طرح دیکھ لیتا ہے۔ شاید کوئی اور اس کی طرف دھیان بھی نہ دے مگر اسلم پرویز کی تحریر میں اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ 'چچی' کے ذکر میں وہ اُن کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چچی نے لگ بھگ اسّی برس کی عمر پائی۔ زندگی کی آدھی صدی انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلّی میں گزاری اور آدھی سے کچھ کم سینتالیس کے بعد کی دلّی میں۔ چچی ان لوگوں میں تھیں جو اپنے زمانے کے علاوہ کسی اور زمانے میں نہ جینا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی جی سکتے ہیں۔ اس لیے چچی نے بجز سینتالیس کے بعد کے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال پرانی دلّی کے اُن ہی محلوں میں گزار دیے جہاں وقت بالکل اسی طرح ٹھہرا ہوا ہے جس طرح سیلاب کے گزر جانے کے بعد سیلاب کا کچھ پانی آس پاس کے گڑھوں میں ٹھہرا رہ جاتا ہے... لیکن سینتالیس کے بعد تو چچی ایک ہی بار فصیل کے باہر آئیں اور وہ بھی تب جب ہم انھیں دلّی دروازے کے باہر پہنچانے آئے تھے۔''

اسلم پرویز کے اسلوب کا قدرتی حُسن وہیں نمایاں ہوتا ہے جہاں وہ اپنی وابستگی کی بدولت اپنے تخیل کے بنائے ہوئے منظرنامے میں پورے کے پورے ڈوب جاتے ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت وہیں ہوتی ہے جہاں اُن کا ساتھ ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جو سچے، بے لاگ اور کھلی ہوئی آب و ہوا میں پھلنے پھولنے والے سدا بہار پیڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ دہلی کے اُستاد رسا ایک زمانے میں دہلی کا بچہ بچہ نہ صرف جانتا تھا بلکہ ان سے ایسی محبت رکھتا تھا جیسے جاتی ہوئی بہار کے باقیات سے ہوتی ہے۔ اُستاد رسا ادبی تاریخ میں دہلی کے ان نامی گرامی اُستادوں میں نہیں تھے جن کے نام سے ادب کے

دبستان بن گئے بلکہ وہ جن اُستادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے وہی ان کے لیے مایۂ
فخر تھا۔ اُن میں ایک اُستادانہ تمکنت تھی۔ رکھ رکھاؤ برتاؤ اور خود اعتمادی کی بنا پر اور
شاعری سے دلچسپی کی بدولت بھی انھیں کوئی اپنے عہد کے اُستاد سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اسلم
پرویز نے ان کو ہر شام اُردو بازار میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس دیکھا اور
چائے خانوں میں ان کے نوع بہ نوع انداز دیکھے۔ اور جب اُن پر لکھنے بیٹھے تو اُن کے
اندر بیٹھا ہوا انشا پرداز جاگ اُٹھا۔ جس نے وہ منظر دیکھا جو زمان و مکاں کی قید سے
آزاد صرف کسی شخص کے دامن کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اُستاد رسا کو یاد کرتے ہوئے
اسلم پرویز ان کے بارے میں اپنے مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

"ہماری اسی زمین پر انسانی بستیوں سے بہت دور ایسے مقامات بھی ہیں
جہاں اب تک کوئی بھولا بسرا شخص بھی نہیں پہنچ پایا ہے۔ ان نامعلوم
مقامات میں بہت سی خوبصورت وادیاں، آبشار، جھیلیں، چشمے، پھل
پھول اور پودے ایسے ہوں گے جو فطرت کی صناعی کا بہترین نمونہ ہوں
گے۔ یہ حسین اور خوش نما منظر قرنوں کی دھوپ چھاؤں میں مٹتے اور
بنتے رہتے ہوں گے۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی منظر بن بن کر مٹ چکے
ہوں گے لیکن ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم، اس لیے کہ
یہ منظر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے باوجود اس بات سے محروم رہے کہ
کوئی ان کی تاریخ مرتب کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے اس کے اوراق
میں محفوظ کر دیتا۔ ہم لوگ جس چیز کو دلّی کی تہذیب کہتے ہیں اور جس
پر بجا طور پر فخر بھی کرتے ہیں، اس کی مثال بھی اُن نامعلوم حسین
منظروں کی سی ہے جو بنتے اور مٹتے جا رہے ہیں اور بس۔ جب یہ منظر

نہیں رہتے تو ہم یہ تک بھول جاتے ہیں کہ یہ منظر کبھی تھے بھی یا نہیں۔
استاد رسا دہلوی بھی ایسا ہی ایک منظر تھے جنھیں آج محض چند لوگ
جانتے ہیں اور کل وہ بھی نہیں ہوں گے۔ جو لوگ استاد رسا کے بارے
میں کچھ جانتے بھی ہیں، ان کی مثال بھی کسی جاں فزا منظر پر سے
گزرنے والی اس ہوا کی سی ہے جو منظر کی خوشبو میں تو ضرور بسی ہوئی
ہوتی ہے لیکن منظر کے عکس و آثار کا پتہ نہیں دیتی۔"

خلیق انجم کو کون نہیں جانتا۔ اسلم پرویز تو خاص طور سے جانتے ہیں۔ تمام عمر کا
تعلق قرابت تو ایک پہلو ہے اس کے علاوہ ایسے رشتے بے شمار ہیں جن کی کوئی فہرست
نہیں بن سکتی مگر پہلے پہل ان کا تعارف کیوں اور کیسے ہوا، اس کا سبب خود ان ہی کی
زبان سے سنیے:

"خلیق انجم کلاس میں پہلی بار قدم رکھتے ہیں تو ایک دوست عشرت
پوچھتا ہے، "ابے یہ بھی یہاں آ گیا۔" میں نے پوچھا، "کون؟" وہ
بولا، "جو ابھی آیا ہے۔ خلیق ہے اس کا نام۔ بڑا حرامی ہے سالا۔"

غرض کہ اس کتاب میں ۲۰ مضامین ہیں۔ جو اس عہد کے اہم ترین لوگوں پر ہیں
اور اُن کی شخصیت کی صفات اور مصنف سے ان کی ذات کے فاصلے کی بنا پر سب کے
بارے میں یکساں انداز سے گفتگو ممکن نہیں تھی۔ جیسا کہ عموماً خاکہ نگار اپنے خاکوں میں
کرتے ہیں۔ اسلم پرویز بے تکلف اور اپنے ہیں دراصل تاثر کے ساتھ ساتھ حدِ ادب کو
کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ دوستوں کے ساتھ مروت اس حد تک ہے کہ اس سے
صرف اسلم پرویز کی شرافت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ ورنہ جن لوگوں نے انھیں اُن کے
دوستوں کی محفلوں میں یا اُن سے چشمکیں کرتے ہوئے دیکھا ہے وہ شاید یہ چاہیں گے

کہ اُن کے خاکوں یا مضامین کے نیچے بھی دیکھنے کو ملیں۔ اُن کے قلم سے نہ سہی ان کے اُن ہم نشینوں کی زبان سے ہی سہی جنھوں نے اسلم پرویز کی حسِ مزاح ہی نہیں بلکہ بسا اوقات جارحیت اور حملہ آوری کا بھی نظارہ کیا ہو۔

مَیں اور شیطاں

(خلیق انجم)

شیطاں کا روایتی تصور تو یہی ہے کہ وہ ملعون ہے، مطعون ہے، خدا کی نافرمانی کرنے والا ہے اور انسان کو تمام برائیاں وہی سکھاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور آسمانوں سے آیا ہوا ہے۔ ہماری زمینی زندگی میں شیطان کے کچھ اور تصورات بھی ہیں، مثلاً معصوم بچے کی شرارت کو شیطانی اور ایسے بچے کو شیطان کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک شیطان، انسان کی اس زندگی کا شریک ہے جو 'درد و داغ و سوز و ساز و آرزو و جستجو' سے عبارت ہے۔ پھر ہمارے معلمین اخلاق نے بھی گناہ گار لوگوں کے اس رویے کی مذمت کی ہے جہاں وہ اپنے کارِ بد کے لیے شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطاں' کو بھی تھوڑا یاد کرتے چلیں

میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جنت کی دیوار پہ چڑھ کر
جنت کے دل چسپ مناظر
نیارے نیارے پیارے پیارے

میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے

موٹی موٹی توندوں والے

لمبی لمبی ڈاڑھی والے

خوف زدہ حوروں کے پیچھے

چٹکی بجاتے ناچتے گاتے

دوڑ رہے تھے بھاگ رہے تھے

میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے

ہماری شعری روایت میں شاعر حق کا علم بردار ہے اور اپنا سلسلہ ابراہیم، منصور، سرمد اور سقراط سے ملاتا ہے اور بقول حافظ نمائشی زہد کو ریا کا مترادف قرار دیتا ہے: "کہ حافظ توبہ از زہد و ریا کرد"۔ اور جب راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطاں' میں شاعر اور شیطان دونوں جو ایک ساتھ 'مولوی کی جنت' کا مضحکہ اڑا رہے ہیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ راجہ مہدی علی خاں کی رو سے زندگی کی اس تگاپوئے دمادم میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم رتبہ اور ہم پلّہ ہیں — اپنے اپنے شخصی امتیاز کے ساتھ۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی مجھ سے میرے 'میں' کے تشخص پر سوال کرے تو میں جواب دوں گا: 'میں کہ خود اپنے ہی مذاق طرب آگیں کا شکار' جب کہ شیطان اسی سوال کے جواب میں کہے گا: 'میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو'۔ یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ مجھ میں اور خلیق انجم میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں تب ہی تو ہم اتنا لمبا ساتھ نبھاتے چلے آرہے ہیں لیکن ان مشترک خصوصیات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئلہ اور پانی دونوں کی ایک مشترکہ خصوصیت بھی پیدا کرنا ہے پھر بھی کوئلہ کوئلہ ہے اور پانی پانی۔ ہاں آپ مجھے اور

خلیق انجم کو ایک ہی سکّے کے دو رخ کہہ سکتے ہیں اور سکّہ بھی دھات کی ابھری ٹکلی کا جس کی ایک ہی پرت ہوتی ہے جہاں دوسری پرت کے چھٹ کر علاحدہ ہوجانے کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ اس انجذاب و انضمام کے باوجود ایک ہی سکّے کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ہیڈ اور دوسرا ٹیل جس کے لیے تقسیم سے پہلے کی اردو میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والے سکّے کے تعلق سے میم حرف کی اصطلاح رائج تھی۔ میم سے مراد انگریز عورت یعنی ہیڈ اور حرف گویا ٹیل۔ اب وہ دنیا جس میں، میں اور خلیق انجم رہتے ہیں، یہ بات تو بخوبی جانتی ہی ہوگی کہ اس سکّے کا ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہیں اور ٹیل اسلم پرویز۔ اور اس بات کی تصدیق و توثیق خود میں اپنے ساتھ خلیق انجم کی اس سدا بہار اور پرشفقت ہیکڑی سے کرسکتا ہوں جسے اسی ہیڈ اینڈ ٹیل کے ایک محاورے میں Head I win, tail you lose کہتے ہیں۔ شیطان کے ذہنی تصور میں شیطان کی وہ ذہانت اور فطانت اور وہ قوتِ مقابلہ اور مجادلہ بھی ملحوظ ہے جسے اقبال جیسے شاعر نے خراج پیش کیا ہے۔ اور جب میں اپنے ساتھ خلیق انجم کو شیطان کہہ رہا ہوں تو سیدھا سا مطلب یہی ہوا کہ اس ایک سکّے کا، جس کے ہم دونوں دو رخ ہیں، ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہوئے اس لیے کہ ذہانت اور فطانت یا بالفاظِ دیگر شیطنت کا تعلق تو سر ہی سے ہے۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ اگرچہ میں اس سکّے کی ٹیل یعنی دم ہوں جس کے کہ خلیق انجم ہیڈ یعنی سر ہیں، لیکن اکثر لوگ مجھے بجائے اس سکّے کی دم کے خود خلیق انجم ہی کی دم سمجھتے رہے تا آں کہ میری شادی نہیں ہوگئی اور میں ہر شوہر مسکین کی طرح اپنی بیوی کی دم نہیں ہوگیا۔ خلیق انجم کی 'ہیکڑی' تو مجھ پر آج تک ہے لیکن اس ہیکڑی اور بیوی کی ہیکڑی میں فرق ہے۔ خلیق انجم کی دھونس تو مجھ پر یہ ہے کہ بیٹا وہ کام تو میں تیرے اچھے سے کرواکے رہوں گا جس کام کے کرنے کے تو لائق ہے اور میری بیوی کا ٹھینگا یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ایسا کام جو خود ان کے بس کا نہیں،

اس کام کو میرے بس کا تو ہونا ہی چاہیے۔ اب چکّی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں برابر رگڑے کھا رہا ہوں۔ پس یوں نہیں چٹکتا کہ سخت جان ہوں اور نکل کے باہر جاؤں تو کہاں کہ ان سے باہر سوائے ایک بے اماں خلا کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ۱۹۴۸ء کا قصہ ہے 'دو چار برس کی بات نہیں' جب میری اور خلیق انجم کی ملاقات ایک دوسرے سے ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کی دلّی شہر میں کئی شاخیں تھیں۔ ایک شاخ دریا گنج میں پٹودی ہاؤس پر بھی تھی جہاں خلیق انجم پڑھتے تھے۔ یہ اسکول کلاں محل سے قریب تھا جہاں خلیق انجم کا گھر تھا۔ میں شروع ہی سے اجمیری دروازے والی مین برانچ میں تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں جب فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اجمیری دروازے پر مدرسہ غازی الدین میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول پھر سے شروع ہوا۔ اب پوری دلّی میں ایک ہی اینگلو عربک اسکول رہ گیا تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک کی تمام سابقہ شاخوں کے بچے کھچے طلبہ نے یہیں داخلہ لیا۔ ایک روز انگریزی کی کلاس جاری تھی، مولانا زبیر قریشی جو کبھی سینٹ اسٹیفن کالج کے طالب علم رہے تھے، زور شور سے مینس فیلڈ کی گرامر سے analysis کا سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک لڑکا شلوار قمیص میں ملبوس، پیروں میں چپل پہنے، سر پر بالوں کا گپھا بنائے، بغل میں کچھ کتابیں دبائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ بظاہر یہ نیو ایڈمیشن کیس تھا۔ مولانا زبیر قریشی نے خلافِ عادت اس لڑکے سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بعد میں اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ اس لڑکے سے ان کی عزیزداری تھی۔ مولانا زبیر قریشی نے نووارد کو ایک خالی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے analysis کا سبق پھر وہیں سے شروع کردیا جہاں سے منقطع کیا تھا۔ میرے برابر کی سیٹ پر عشرت نام کا ایک لڑکا بیٹھتا تھا۔ یہ لڑکا اس سے پہلے پٹودی ہاؤس کی

برانچ میں تھا۔ عشرت نے اس لڑکے کے داخل ہوتے ہی کہا، 'ابے یہ بھی یہاں آگیا۔' میں نے پوچھا، 'کون؟' وہ بولا، 'یہی جو ابھی آیا ہے۔ خلیق ہے اس کا نام، بڑا حرامی ہے سالا۔' اس وقت اس لفظ حرامی کا استعمال نہ تو عشرت ہی نے سوچ سمجھ کر کیا تھا اور نہ میں ہی اس کے دوررس امکانات کا اندازہ لگانے کا اہل تھا۔ آج باون برس بعد جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں اس لفظ حرامی کے معنی یہ آرہے ہیں کہ خلیق انجم دنیا میں صرف اپنی شرطوں پر جینے کے لیے پیدا ہوا ہے اور اس انداز سے جینے کے عذاب ثواب کا بھی وہ تنہا ہی حصے دار ہے۔ عام طور پر لوگ جب کسی کام کی طرف بڑھتے ہیں تو پہلے وہ یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ یہ کام کر بھی سکیں گے، اپنے آپ کو ناپتے تولتے ہیں۔ خلیق انجم کا مزاج یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، اسی کے ساتھ وہ ہاتھ کے ہاتھ اپنے اندر ایک عملی فراست کو جنم دیتا ہے اور پھر اس فراست کے اسپِ تازی کی راسیں کھینچتے ہوئے وہ اس آگ کے دریا کے پار اتر جاتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے عقل کو کہیں عشق کا آئینہ دکھلایا ہے، کہیں دل کا، کہیں جنوں کا اور کہیں خبر کا۔ خلیق انجم عقل کو عمل کا آئینہ دکھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خلیق انجم کارزارِ حیات میں عمل سے کتنا کام لیتے ہیں، یہ تو آپ کو ان کے مقربین میں سے کوئی بتا سکتا ہے۔ رہا یہ کہ انھیں عقل کی رہ نمائی کتنی حاصل ہے، یہ سوال خود انھی سے پوچھنے کا ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ محض عقل سے کام لینے والے زندگی میں زیادہ تر پھسڈی ہی ثابت ہوئے ہیں۔

ہاں تو میرے کلاس فیلو عشرت نے خلیق کے لیے لفظ حرامی کا جو استعمال کیا، اس کے تعلق سے میرے نزدیک کسی مخربِ اخلاق رویّے کی عدم موجودگی کے باوجود کسی کو حرامی کہنے کی نفسیات یہی ہے کہ یہ شخص ہم سے آگے کیوں نکلا جارہا ہے۔ گھپلا دراصل

یہ ہے کہ بعض لوگ یوں بھی حرامی ہیں اور دوں بھی حرامی اور وہ اپنے اس طرح کے حرامی پن کو اس طرح کے حرامی پن سے آلودہ کیے رکھتے ہیں۔ لیکن جو حرامی پن خلیق انجم سے منسوب کیا جاسکتا ہے وہ انتہائی شفاف transparent اور مستحسن قسم کا حرامی پن ہے۔ اور جس عمر کے حوالے سے عشرت نے خلیق کے بارے میں یہ بات کہی وہ تو معصومیت کی وہ شرارت ہے جسے ہم شیطانی کہتے ہیں۔ خیر تو اگلے ہی روز اسکول میں جب تفریح کا گھنٹہ بجا تو میں معمول کے مطابق اپنے ایک دوست کے انتظار میں کینٹین کے سامنے جا کھڑا ہوا، ساتھ چائے پینے کے لیے۔ وہ دوست تو نہیں آئے البتہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے خلیق چلے آرہے ہیں۔ مجھے ایک دم ان کے بارے میں عشرت کا دیا ہوا خطاب یاد آگیا، اس لیے انھیں دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سراسیمہ سا ہونے کی تیاری میں لگ گیا۔ اتنے میں وہ قریب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ایک دم بے تکلفی برتتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا 'چائے پییں گے؟' اور اسی کے ساتھ ہم چائے کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہم چائے کے ساتھ ایک دوسرے کے بارے میں باتیں پوچھتے رہے اور کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے گئے۔ چائے کا کپ ختم ہونے کے بعد خلیق نے جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور پہلے مجھے سگرٹ پیش کیا جو میں نے بلاتردد قبول کرلیا۔ میں نے مکمل اناڑی پن سے اور خلیق نے کمالِ مہارت سے اپنا اپنا سگرٹ جلایا۔ میں سگرٹ کا دھواں باہر کے باہر ہی چھوڑتا رہا اور وہ جلدی جلدی لمبے لمبے کش اندر کی طرف بھرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے اپنے اپنے سگرٹ کے ٹوٹے کینٹین کی بھٹی میں جھونکے اور چل دیے پھر کلاس کی طرف۔ آہستہ آہستہ ہم اسکول سے واپسی پر بھی ساتھ نکلنے لگے جہاں سے ہم ادھر ادھر گھومتے اپنے اپنے گھر پہنچتے۔ ایک روز ہم اسکول کے باہر اس گھاس کے میدان میں بیٹھے سگرٹ

پی رہے تھے جو اس زمانے میں شاہی کا تلاؤ (شاہ جی کا تالاب) کہلاتا تھا اور جہاں اب کملا مارکیٹ ہے۔ باتوں باتوں میں خلیق نے مجھ سے پوچھا، 'آپ نے سگرٹ کیسے شروع کیا۔' میں نے کہا، 'میں تو سگرٹ پیتا ہی نہیں، بس جب آپ پیش کرتے ہیں تو ایک آدھ اب پینے لگا ہوں۔' خلیق نے یہ سن کر میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگرٹ لے کر توڑ کر پھینک دیا اور کہا، 'نہیں پیتے تو مت پیجیے۔ یہ لت بہت بری ہے، لگ جائے تو پیچھا مشکل ہی سے چھوڑتی ہے۔'

انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ان میں تقدیر کو ماننے یا نہ ماننے سے قطع نظر ماحول، وراثت اور سرشت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس وقت میں اور خلیق انجم ایک دوسرے سے ملے، باوجود اس کے کہ اس وقت ہماری عمریں ہی کیا تھیں، خلیق کے والد کو گزرے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے پر میرے والدین حیات تھے۔ اس اعتبار سے خلیق کی حیثیت ایک آوارہ پنچھی کی سی تھی اور میری سنہری پنجرے کے قیدی کی سی۔ گویا خلیق نے 'جہنم کے آزاد شعلوں' کی لپیٹ میں جینا سیکھا اور میں نے 'غلامی کی جنت' میں پرورش پائی۔ چناں چہ خلیق نے شروع ہی سے اختر الایمان کے 'آوارہ منش آزاد سیلانی' لڑکے کی طرح زندگی کی رزم گاہ میں دوڑنگے لگانے شروع کردیے تھے۔ اس طرح خلیق نے مارک ٹوین کے ٹام سویر اور ہیکل بری فن کی طرح زندگی کے بہت سے ایڈونچرز کا مزا لڑکپن ہی کی عمر میں چکھ لیا تھا۔ میری شخصیت پہ اس عہد کے اس روایتی باپ کا سایہ تھا جس کے پُرہیبت ماڈل کو سامنے رکھ کر شاید ہماری زبان میں 'باپ رے باپ' کا محاورہ وجود میں آیا ہے۔ باپ کی بالواسطہ شفقت اور براہ راست خشونت، کچی مٹی کے گھڑے جیسے میرے لڑکپن پر دباؤ ڈالنے والی ان کی صلابتِ ایثار، میرے مستقبل کے تحفظ کی فکر میں میری شخصی آزادی کو مصلوب رکھنے کی ان کی سوجھ

بوجھ، سونے کا نوالا کھلانے اور قہر کی نگاہ سے دیکھنے کا ان کا رویہ، کھیل کود کو مجھ پر اس طرح حرام کردینے کا فتویٰ جیسے مسلمان پر سور کھانا، وضع قطع اور لباس کے معاملے میں خود میری پسند ناپسند پر اپنی پسند ناپسند کو ترجیح، گھر سے باہر نکلنے پر پہرے، یہ وہ خزانہ تھا جس سے گھر کی چہاردیواری میں میں مالامال تھا۔ لیکن خلیق کی طرح بھرے بازار میں بالی عمریا کو سر اٹھا کر لیے چلنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں خلیق کا وجود تازہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کھڑکی کی طرح مجھ پر کھلا جس کے اس طرف اُن خوش گوار آوارگیوں کا بہارستان تھا جس میں شخصیت لالۂ خودرو کی طرح نشوونما پاتی ہے۔ اس بہارستان میں خلیق جیسوں کی عملداری تھی اور ہم جیسے تو اس میں گھر سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب اینگلو عربک اسکول دوبارہ کھلا تو دو تین سال تک پڑھائی کی اتنی بری حالت رہی کہ بورڈ کے امتحانات میں فیل ہونے والوں کی شرح صد فی صد رہی۔ اس میں بڑا دخل ہم مسلمان بچوں کے لیے Higher Mathematics کے اس مضمون کا تھا جو اس وقت لازمی تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک اسکول کے بیشتر لڑکوں نے اس زمانے میں دسویں کے امتحان کے بعد علی گڑھ کا رخ کرنا شروع کردیا۔ خلیق نے علی گڑھ چلنے کے لیے مجھے بھی اکسایا۔ مجھے یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا تھا اس لیے کہ میرے والد تو گھر ہی سے نکلنے کی اجازت مشکل سے دیتے تھے کجا کہ دلی چھوڑ کر علی گڑھ چلے جانا۔ میں نے خلیق سے کہا، یار مجھے تو اس بارے میں اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن معاملہ اصل میں والد کے رعب سے زیادہ اس کمیونی کیشن گیپ کا تھا جس کے سبب میں والد سے خود ان کی قوتِ رعب سے بھی کہیں زیادہ مرعوب تھا۔ حال آں کہ معاملہ یہ تھا کہ تمام تر سختی کے باوجود میری اعلا تعلیم

کے لیے ہمیشہ کوشاں اور فکرمند رہتے تھے۔ خلیق کے لیے یہی نکتے کی بات تھی۔ چناں چہ کیس یہ بنایا گیا کہ اس وقت دلّی میں مسلمانوں کے لیے جو ناسازگار فضا ہے اس میں مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کے راستے بند ہیں اور اب علی گڑھ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیس کی وکالت کے لیے جناب اختر ہاشمی کو معہ ان کی ڈاڑھی، ٹوپی اور اچکن کے ساتھ لیا گیا اور تھوڑی ہی سی ردوکد کے بعد میرے حق میں یہ مقدمہ فیصل ہوگیا کہ والد صاحب مجھے علی گڑھ بھیج دیں گے یوں اور بھی کہ وہاں میں اکیلا نہیں ہوں گا، خلیق بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ اب علی گڑھ پہنچ کر تو ہم کو گویا ہوا لگ گئی۔ اب مجھ پر سرشاری کا کچھ وہی عالم تھا جو ابو خاں کی بکری چاندنی پر رسی تڑا کر آزاد ہونے کے بعد طاری ہوا تھا اور یہاں ابو خاں کی رعایت بھی خوب تھی کہ میرے والد بھی خاں صاحب تھے۔ میرے والد نے اگرچہ مجھے علی گڑھ اپنی مرضی ہی سے بھیجا تھا لیکن ان کے ذہن کے کسی گوشے میں کہیں نہ کہیں ویسی ہی [illegible] ناگواری بھی تھی جس سے ماں باپ کو بیٹی جدا کرتے ہوئے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس نفسیاتی گرہ کو ڈھیلا کرنے کے لیے وہ کبھی کبھی کوئی حیلہ لطیف سی سرزنش کا نکال لیا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں کے لیے انھوں نے خلیق کا نام چودھری خلیق الزماں رکھ چھوڑا تھا۔

خلیق نے دوستی کا ناتا جوڑتے ہی اپنی چھٹی حس کے ذریعے میرے بارے میں بہت سے فیصلے خود ہی کرلیے تھے۔ یعنی یہ کہ یہ شخص مخلص ہے، بھروسے کے قابل ہے، تابع دار ہونے کی حد تک وفادار ہے، صاف دل ہے اور یہ بھی کہ ایسا آدمی اندر سے انتہائی کم زور ہوتا ہے۔ وہ مروت کے دائمی مرض میں مبتلا ہوتا ہے، وہ خودمختار نہیں ہوسکتا، اس میں اخلاقی جرأت کی کمی ہوتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک ایسے جبری سرپرست کا ہونا نہایت ضروری ہے جو اپنی مشکلات کی باڑ کاٹتے ہوئے اپنا رستہ صاف کرنے کے ساتھ

ساتھ اسے بھی راستہ دکھاتا چلے۔ لیکن جس طرح ریڑھے کے اڑیل ٹٹو کا مالک بیچ سڑک پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ٹٹو کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر لے چلنے کے بجائے چابک مار مار کر اسے بالآخر چلتا کرتا ہے اسی طرح خلیق بھی مجھے چلاتے رہے ہیں میری اپنی ہی ٹانگوں کے بل پر۔ یہ خلیق کا میری زندگی میں ایک اہم رول ہے۔ خیر تو ان کے اس سرپرستانہ رویّے کے معنی ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے یہ طے پائے کہ یہ باس اور میں ان کا سب آرڈی نیٹ۔ اب ان تعلقات میں ایسے مقامات بھی آتے رہے ہیں جہاں وہ داستانوں کے بادشاہ اور میں ان کا وزیر باتدبیر ثابت ہوا ہوں مگر بادشاہ پھر بادشاہ ہے اور وزیر وزیر۔ چناں چہ کبھی کبھی وزیر کی تدبیر بھی بادشاہ ہی کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔

علی گڑھ میں ہم چار سال رہے۔ ہمارے علی گڑھ پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد شہر سے 'شمع' کی طرز کا ایک فلمی رسالہ 'جھلک' جاری ہوا۔ ایک انٹرمیڈیٹ فیل قسم کے طاہر صدیقی عرف طاہر علیگ اس کے اڈیٹر تھے۔ خلیق نے رسالے میں چھپنے کے لیے کچھ بھیجا اور اڈیٹر کے نام لچھے دار قسم کا ایک خط بھی لکھا۔ جواب میں طاہر علیگ صاحب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور پھر ایک دن خود ہی ملاقات کے لیے ممتاز ہوسٹل چلے آئے اور اسی ملاقات میں یہ طے پا گیا کہ اگلے شمارے سے خلیق 'جھلک' کے اڈیٹر ہوں گے۔ علی گڑھ جیسے چھوٹے سے شہر سے 'جھلک' جیسا نیم فلمی نیم ادبی پرچہ نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ آدھا پرچہ تو خود تصنیف کیجیے اور باقی آدھا چلتے ہوئے فلمی پرچوں سے نقل کیجیے۔ اب یہ باس اور سب آرڈی نیٹ والا معاملہ جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، میرے اور خلیق کے درمیان ہمیشہ سے ایک طرح کی باہمی انڈرسٹینڈنگ رہا ہے، یہ کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ڈرائنگ روم میں دو اشخاص ایک ساتھ داخل ہوں اور

اپنے اپنے حوصلے یا کم ہمتی، خود اعتمادی یا انکساری، رعونت یا بردباری کے مطابق بنا کسی ردوکد، بنا کسی کنفیوژن، بنا کسی تبادلۂ تکلفات، ان میں سے ایک زیادہ آرام دہ اور قدرے ممتاز اور دوسرا نسبتاً کم آرام دہ اور دورافتادہ نشست اختیار کر لے۔ علی گڑھ میں بی اے کے آخری سال میں چلتے چلتے ہم نے ایک دہلی کیفے بھی کھول ڈالا۔ یہ گولڈن آئیڈیا بھی خلیق انجم ہی کا تھا۔ یوں تو حقیقتاً یہ ہم دونوں کا مشترکہ وینچر تھا لیکن عملی طور پر فیصلے کرنے اور پالیسی بنانے کی مالکانہ قسم کی ترجیحات خلیق انجم کا حصہ تھیں اور انتظامی امور کی پیروی میری ذمے داری تھی۔ اس وینچر کا کیا انجام ہوا اس پہیلی کا حل آپ سوچیے، اتا پتا یہ ہے:

یہ لوگ کیوں مری عریانیوں پہ ہنستے ہیں
لباس پھونک کے میں خود کو تو بچا لایا

مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہوسٹل میں ہم دس گیارہ لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگوں میں ہاسٹل لائف کی پھونک کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی۔ activity کرنا، پروکٹوریل قوانین کی خلاف ورزی کرنا ہمارا صبح و شام کا معمول تھا۔ اس گروپ کے دو سرغنے تھے، ایک میرٹھ کی نادر علی بلڈنگ کے کسی پولس آفیسر کے فرزند اعجاز اور دوسرے خلیق انجم۔ ہم نے شرارتوں کے میدان میں کئی تاریخی کارنامے انجام دیے، جن کے نتیجے میں کچھ کو یونیورسٹی سے ڈیبار ہونا پڑا، کچھ پر جرمانے ہوئے لیکن سزا سے صاف بچ نکلنے والوں میں جو لوگ شامل تھے، ان میں ایک خلیق انجم بھی تھے۔

علی گڑھ میں ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لیے ہم دونوں انجم اسلم ہی کے نام سے مشہور تھے۔ بعض لوگوں کو ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی اس لیے کہ ہم دونوں کی مثال کسی چلتی ہوئی سائیکل کے ایسے دو پہیوں کی سی تھی جس کا اگلا پہیا سو میل فی

گھنٹے اور پچھلا دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتا تھا، پھر بھی دونوں اس چلتی ہوئی سائیکل کا اٹوٹ انگ تھے۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے، یہ خلیق بڑا چلتا پرزہ ہے مگر اس کے ساتھ جو وہ گورا سا لڑکا رہتا ہے وہ بہت سیدھا ہے۔ مگر میں اس کا مِلی میٹ سے کچھ خوش نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ مجھے اس موقعے پر منٹو کی ایک کہانی کا وہ کردار یاد آجاتا تھا جو والنٹیر تھا اور جب ایک بار اس کی محبوبہ نے اس سے اس لفظ والنٹیر کی وضاحت چاہتے ہوئے یہ پوچھا تھا کہ والنٹیر کسے کہتے ہیں تو اس نے برملا جواب دیا تھا 'الو کے پٹھے کو'۔

آج میں جہاں بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں، کبھی جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر خلیق کا وجود میری زندگی میں نہ ہوتا تو جانے میری زندگی کا رخ آج کیا ہوتا۔ یوں تو آدمی زندگی میں جو کچھ بنتا ہے اپنی ذاتی صلاحیتوں ہی کے بل پر بنتا ہے لیکن اس کے کچھ بھی بننے کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے ابتدائی زندگی میں کیسے ساتھی ملے، وہ کن لوگوں کے حلقۂ اثر میں رہا۔ خلیق انجم کے مزاج میں بلا کی سیمابیت ہے وہ ہمیشہ سے ایک بہت ہی ambitious انسان رہے ہیں۔ ہر ambitious انسان کی اپنے ambitions پورا کرنے کی ایک ethics ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ethics مجھ جیسے unambitious انسان کی ethics سے یقیناً مختلف ہوتی ہے لیکن ambitious لوگوں میں اس ethics کے ان کی اپنی اپنی اچھی یا بری فطرت کے مطابق الگ الگ درجات ہوتے ہیں۔

بے جا مروت، جرأت اخلاق کی کمی، شائستگی کی بلندیوں کو چھونے کی للک، اپنے حقوق کا گلا گھونٹنے کا رویہ، چوری چھپے محنت کرنے کی عادت، اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی نہ کہہ سکنے یا نہ کر سکنے کی کمی، یہ میری شخصیت کی وہ کمزوریاں رہی ہیں جو کسی شخص کو کہیں

کا بھی نہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسا کیوں ہوا کہ میرے حصے میں کہیں کا بھی نہ رہنا نہیں آیا۔ اس کا جواب اگر صرف ایک لفظ میں پوچھیے تو یہ ہے کہ خلیق۔ اگر خدانخواستہ یہی مزاج جو میرا ہے خلیق کا بھی ہوتا تو 'ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے' والا مضمون ہو جاتا لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اگر ہوا تو یہ کہ 'ہم تو تیرے ہیں صنم تم کو بھی لے تیریں گے'۔۔۔ خلیق انجم کی نظر ہمیشہ accomplishment پر رہی ہے۔ ایسا آدمی پچھڑتا نہیں، اپنے نشانے کی طرف تیر کی سی تیزی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ میں اس کے برخلاف perfectionism کے خواب زاروں کا سیلانی ہوں۔ ایسے آدمی کا ایک ایک قدم بھاری پڑتا ہے۔ وہ دو قدم آگے چلتا ہے تو دس قدم پیچھے پھسل پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں میری زندگی کو ایک ایسا آدمی چاہیے تھا جو مجھے وقتاً فوقتاً دوڑائے رکھے اور وہ آدمی خلیق انجم کی صورت میں وقت سے بہت پہلے مجھے مل بھی گیا۔ دراصل ایک لکھنے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں نے اپنے آپ کو جتنا دریافت کیا ہے وہ خلیق انجم ہی کے توسط سے کیا ہے۔ اب اگر اس میدان میں میرا بھی اپنا کوئی جوہر ہے جو ان تمام جواہر سے علاحدہ ہے جو خلیق انجم کی ذات سے متشخص ہیں تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔ اگر زمانے نے زمین کی قوتِ کشش کو نیوٹن کے توسط سے دریافت کیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہی قوتِ کشش خود نیوٹن میں بھی ہو اور ایسا ہے بھی نہیں، اس کے باوجود نیوٹن کی عظمت اپنی جگہ برقرار ہے۔

اگر ہم دلّی چھوڑ کر علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ دہلی ہائر سیکنڈری بورڈ کی Higher Mathematics کے لازمی مضمون کی خلیج کو ہم کبھی پار نہ کر پاتے اور ہم پر یونیورسٹی ایجوکیشن کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوجاتے۔ مجھ کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڑھ لے جانے والے بھی خلیق ہی تھے۔ علی گڑھ سے واپس آکر میں نے ہفت

روزہ 'آئینہ' کی ملازمت اختیار کرلی اور خلیق انجم بجلی کے پرانے پنکھے بنانے کی فری لانسنگ میں لگ گئے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ دن کے گیارہ بجے خلیق میرے پاس 'آئینہ' کے دفتر میں آئے اور دفتر سے چھٹی دلا کے سیدھے دلی کالج پہنچے۔ میرے پوچھنے پر کہ آخر قصہ کیا ہے، بتایا کہ کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب سے بات کرنی ہے اُردو ایم۔اے میں داخلے کے لیے۔ بس یہیں سے ہماری زندگیوں کا رخ اس طرف مڑ گیا جہاں آج ہم ہیں۔

ہمارے ایم۔اے فائنل کے امتحانات قریب تھے کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا جس کے سبب میں امتحان اس سال نہیں دے سکا۔ خلیق کا ایم۔اے مجھ سے ایک سال پہلے مکمل ہوگیا۔ ان دنوں ڈاکٹر سروپ سنگھ کروڑی مل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے۔ وہ کالج میں اُردو کا شعبہ بحال کرنے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب سے رجوع کیا کہ وہ اپنے کالج کا کوئی ایسا ایم۔اے پاس طالب علم انھیں دیں جو دلی والا ہو اور بیگ صاحب اس کی لیاقت سے مطمئن ہوں۔ بیگ صاحب نے فوراً ہی خلیق انجم کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کی جانب روانہ کردیا۔ خلیق انجم نے پہلے سال پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے پڑھایا اور اس ایک ہی سال میں نہ صرف پورے کالج میں اپنے لیے فضا ہموار کرلی بلکہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کرلی۔ ایک سال بعد جب لکچرر کی پوسٹ کے فل ٹائم اور پرمننٹ ہونے کا موقع آیا تو ایک صاحب جو سینٹ اسٹیفن کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر تھے، وہ بھی میدان میں آ کودے اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاید یونیورسٹی کے صدر شعبہ بھی ان پر مہربان تھے۔ خلیق انجم نے ان خدشات کا اظہار ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ سے کیا اور بیگ صاحب کو بھی صورت حال سے آگاہ کردیا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ ٹھہرے کھرے جاٹ۔ انھوں نے خلیق سے کہا، 'دیکھو میں نے

یہ پوسٹ صرف تمھارے لیے نکلوائی ہے اور میں نے تمھاری ایک سال کی کارکردگی میں یہ دیکھ لیا ہے کہ آگے چل کر کیمپس کے کالجوں میں اگر کروڑی مل کالج کے شعبۂ اُردو کو اپنا کوئی امتیاز قائم کرنا ہے تو وہ تم جیسے آدمی کے یہاں رہتے ہی ہوسکتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، اگر صدر شعبہ نے کسی اور شخص کو کالج پر تھوپنے کی کوشش کی تو میں یہ پوسٹ ہی ختم کردوں گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے، صدر شعبہ کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کا عندیہ پتا چل گیا اور پھر وہی ہوا جو ڈاکٹر سروپ سنگھ چاہتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کے شعبۂ اُردو کو آسمانوں پر پہنچا دیا۔ شعبے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے جنھیں یہاں دہرانے کا محل نہیں۔

کروڑی مل کالج سے چل کر وزارتِ تعلیم میں گجرال کمیٹی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے خلیق انجم، انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر پہنچے۔ یہاں ایک دل چسپ بات کا ذکر ضروری ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہوسٹل میں ہمارے ونگ کا بیرا بہادر نامی ایک بڑھا شخص تھا۔ پاس ہی کے بہال پور گاؤں کا رہنے والا۔ وہ اسی زمانے سے خلیق انجم کو انجمن صاحب کہا کرتا تھا۔ اس کی یہ پیش گوئی خلیق انجم کے حق میں پتھر کی لکیر بن گئی۔ چناں چہ آج وہ اُردو گھر میں اپنے پورے شان وشکوہ کے ساتھ انجمن صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ اُردو گھر کی یہ بلند و بالا اور شان دار عمارت جو ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کی سرپرستی اور رہ نمائی کے ساتھ خلیق انجم کی شخصیت کا وہ ڈائنامزم بھی شامل ہے جس کی تعریف کرنے والے، جس پر رشک کرنے والے اور جس سے جلنے والے بھی طرح طرح کے لوگ موجود ہیں۔

خلیق انجم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی سے روزگار کے وسائل کی تلاش میں کبھی جھوٹے وقار کو اپنے راستے کا پتھر نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر کام کو

خواہ وہ اکادمک نوعیت کا ہو یا کسی اور طرح کا اور کسی بھی سطح کا، اسے پوری dignity of labour کے ساتھ کیا۔ ان کاموں میں ڈاک خانے کے باہر بیٹھ کر خط لکھنا، سرِ بازار دکان کے پٹرے پر بیٹھ کر بجلی کے پرانے پنکھوں کی مرمت کرنا، کروڑی مل کالج کی لکچرر شپ، گجرال کمیٹی کی ڈائرکٹر شپ، جامعہ اُردو کی وائس چانسلری اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کی جنرل سکریٹری شپ یہ سبھی شامل ہیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے خلیق انجم کے اور اپنے تعلق سے accomplishment اور perfectionism کی بات کہی تھی۔ معاملہ یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ہی ساتھ بہت سارے کام کرنے ہوں، اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی کام کو لیے بیٹھا اس میں مینا کاری کرتا رہے۔ وہ مخالفتوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ صحیح کام کو ہر قیمت پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کوشاں رہتا ہے چاہے اس کے لیے کبھی کبھی غلط راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ وہ ایک کام کی تکمیل کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر دم لینے کا بھی قائل نہیں ہوتا بلکہ پچھلے کام کی تکمیل سے پہلے ہی وہ کسی اگلے کام کا منصوبہ بنا کر اس کی ابتدا بھی کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی ایک نفسیات اور بن جاتی ہے۔ اس کے پاس دوسروں کی سننے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات کو احکام کی طرح صادر کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کو ان کی بات کہنے کا موقع کم ہی دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دوسروں کے پاس تو اپنی بات کہنے کا وقت ہی وقت ہے، لیکن اسے تو انجمن ترقی اُردو (ہند) جیسی کل ہند تنظیم کو چلانا ہے، اُردو تحریک کے جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلنا ہے، شاعروں کے مزارات کی بازیافت کے لیے سپریم کورٹ میں وکیل کی جگہ خود کھڑے ہو کر مقدمے کی پیروی کرنی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں 'خطوط غالب' اور 'آثار الصنادید' کی تدوین جیسے علمی اور ادبی کارنامے بھی انجام دینے ہیں جو اسے آگے

چل کر تاریخ ادب اُردو کا ایک حصہ بنانے والے ہیں۔ اس درجہ فعال شخصیت میں تھوڑا بہت عنصر خودسری کا شامل ہونا لازمی سی بات ہے۔ اس خودسری کو بعض لوگ چودھراہٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کام کے راستے میں اڑنگے لگانے والوں کے ہجوم کے سروں پر سے چھلانگ لگانے کے لیے کبھی کبھی چودھراہٹ بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ صالح مقاصد کے حصول کے لیے چودھری بننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ situational ethics کی رو سے تو بسا اوقات قتل کر گزرنا بھی مستحسن قرار پا جاتا ہے۔ چودھری کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے، وہ ان معاملات کی کوکھ سے ہی پیدا ہوتے ہیں جن معاملات کو چودھری چاہیے ہوتے ہیں۔ چودھری مرزا محمود بیگ، چودھری خواجہ احمد فاروقی، چودھری انور جمال قدوائی، چودھری سروپ سنگھ یہاں تک کہ چودھری خلیق انجم بھی ایسی ہی کچھ مثالیں ہیں۔

جب شاعر یہ کہتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولہ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تو اس شعر میں خرابی کا سیدھا سا اشارہ بظاہر برق خرمن ہی کی طرف ہے۔ لیکن کبھی کبھی خون گرم بھی تھوڑی بہت خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں 'تھوڑی بہت' کے لفظ پر اصرار کرتے ہوئے اس شعر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

میں جانتا ہوں کہ خلیق انجم ہائپرٹنشن کے مریض نہیں ہیں۔ میں یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تخریب پسند بھی نہیں۔ ان کے ہاں مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا

نہیں اس پر سبقت لے جانے کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ ہر محاذ پر مقابلے کے لیے ڈٹے رہنا ان کا مزاج ہے۔ نئے نئے مقابلوں کی تلاش ان کی زندگی کا مشغلہ ہے۔ ان کاموں کے لیے لہو گرم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے مخالفین کے ساتھ یہاں تک کہ دوستوں کے ساتھ بھی کبھی کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں چلتی رہنی چاہییں۔ ایسی جھڑپوں میں مدمقابل کو زچ کردینے کے خلیق انجم کے پاس بہت سے پینترے ہیں۔ مثلاً کسی بحث کے آغاز ہی میں اپنی بات زوروشور سے کہی اور سامنے والے شخص کی جانب سے اس بات کا جواب آنے سے پہلے ہی بجلی کی سی تیزی سے گفتگو میں گریز کا پہلو نکال کر کوئی اور بات شروع کردی یا اپنی بات کے جواب میں اگر دوسرے کی بات سنی بھی تو اس کے سامنے اس بات کو یہ کہتے ہوئے گویا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا 'اچھا چھوڑو یار کوئی اور بات کرو'۔

میرے ساتھ خلیق انجم کا معاملہ دنیا سے نرالا ہی ہے۔ وہ کوئی پروگرام، کوئی اسکیم، کوئی پراجیکٹ بنائیں اس کے لیے میرا نام ان کی سمجھ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ پھر ساتھ میں یہ بھی کہیں گے، یار تم کام وام تو کرتے نہیں اب تمھارا نام رکھا ہے تو مجھے رسوا نہ کردینا۔ میرے کام نہ کرنے سے ان کی عزت آبرو اتنی جلدی خطرے میں پڑتی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس سیمناروں کے دعوت نامے آتے ہیں جن میں سے بعض لوگ شرکت کی منظوری بھیج دینے کے بعد بھی نہ سیمنار کے لیے مقالہ لکھتے ہیں اور نہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور منتظمین بھی پہلے سے ان تمام باتوں کا حساب کتاب لگا کر چلتے ہیں کہ اتنے لوگوں کو دعوت نامہ بھیجا جائے گا، ان میں سے اتنے آپائیں گے اور جتنے آجاتے ہیں کبھی کبھی وہ بھی زیادہ ہی پڑجاتے ہیں۔ مگر یہ منتظمین بقول خلیق صاحب انھیں یہ کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں، دیکھیے خلیق صاحب آپ کے

مشورے پر ہم نے اسلم پرویز صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تھا اور وہ نہیں آئے، ہمارا سارا پروگرام گڑبڑ ہوگیا۔

لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر دنیا میں خلیق انجم کے سب سے قریب کوئی ہے تو وہ میں ہوں لیکن روح الامین کے عروج سے بھی ایک اگلی منزل معراج کی ہے اب اس کا مطلب آپ خود ہی سمجھ لیں۔ نزدیک ترین کی اصطلاح بھی دو چیزوں یا دو افراد کے درمیان کسی نہ کسی نوع کے فصل کا اشاریہ ہے خواہ وہ فصل بال برابر ہی کیوں نہ ہو۔ تو اس نزدیکی کی بنا پر بعض لوگ جو خلیق انجم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے پکڑتے ہیں یہ سوچ کر کہ سب سے زیادہ قابو خلیق انجم پر شاید میرا ہی ہے۔ خلیق انجم پر بھلا کس کا زور چلا ہے اور اگر چلے گا بھی تو صرف اس کا جس کا زور وہ اپنے پر چلوانا چاہیں گے۔ میں ٹھہرا گھر کی مرغی۔ میرے ان سے قریب ترین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بات کے لیے جتنا صاف صاف مجھے منع کرسکتے ہیں دنیا میں کسی کو بھی نہیں کرتے۔ کسی دوسرے کی کوئی بات مانیں گے تو اس کی کوئی رگ بھی دبے گی ان سے۔ میری بھلا وہ کون سی رگ دبا لیں گے پہلے ہی سے ساری رگیں دبائے بیٹھے ہیں۔

خلیق انجم بلا کے حاضر جواب ہیں اور اتنے ہی بلا کے وہ حاضر دماغ بھی ہیں۔ اکثر بحث و مباحثے میں وہ اپنی اسی طاقت کے بل پر دوسروں کو چت کردیتے ہیں۔ وہ باتوں باتوں میں ہاتھ کے ہاتھ اس پھرتی سے کوئی دلیل گھڑ کر پیش کردیں گے کہ اس دلیل کے غیر معتبر ہونے کا دوسرے کو کوئی گمان بھی نہیں گزرے گا۔ مثلاً ایک بار میں نے ان سے کہا کہ یار میرا فلاں شاگرد ترقی اردو کونسل میں فلاں پوسٹ کے لیے درخواست دینا چاہتا ہے اس کے لیے اسے ایک experience سرٹیفکٹ چاہیے۔ تم اپنے دفتر کے لیٹر ہیڈ پر اسے ایک سرٹیفکٹ بنوا کر دے دو۔ ابھی میرا فقرہ پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا

تھا کہ اُدھر سے اس کا جواب بھی چل پڑا، ”یار میں پہلے ہی دو امیدواروں کو اس قسم کے سرٹیفکٹ دے چکا ہوں، اب اور نہیں چلے گا۔“ میری سمجھ میں فوراً ان کی یہ بات آ گئی۔ میں نے کہا، ”اچھا تو اس نوکری کے لیے اس کی وہاں سفارش ہی کر دو۔“ اس بات کا برجستہ جواب یہ ملا کہ ”یار صرف ایک پوسٹ ہے اور اب تک سو درخواستیں وہاں پہنچ چکی ہیں۔ ان میں دس بیس تو یقیناً بڑی سفارشوں والی بھی ہوں گی، ایسے میں میری سفارش کیا کرے گی۔“ میں ان کی یہ بات سمجھنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ بہرحال طالب علم سے کہا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بنا پہلی فرصت میں درخواست تو دے ہی آئے اور پھر آ کر مجھے بتائے۔ پھر اگلے روز جب وہ طالب علم پہلی ہی فرصت میں درخواست داخل کر کے میرے پاس آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس پوسٹ کے لیے دفتر میں سب سے پہلے پہنچنے والی درخواست تو خود اسی کی تھی۔ خلیق انجم کا بیٹا ثمر جیٹ ایرویز میں کسی اچھی پوسٹ پر لگا ہوا ہے۔ ایک روز میں نے خلیق انجم سے کہا، ”یار ثمر سے کہہ کر فلاں لڑکے کو جیٹ ایرویز میں کسی چھوٹی موٹی نوکری پر لگوا دو۔“ فوراً سے بھی پیشتر جواب آیا، ”ابھی ٹھہر جاؤ یار، وہ پہلے ہی دس پندرہ دوستوں کو وہاں لگوا چکا ہے۔“ بہرحال جہاں تک ان کی طرف سے خود اپنے طور پر میری ذات کو فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اسی قدر فعال رہتے ہیں جس قدر کہ میں خود مجہول ہوں۔

خلیق انجم اپنے روزانہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں رات کو دس بجے اپنے بستر پر ہوتے ہیں۔ صبح ساڑھے چار بجے اٹھ کر اپنے مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب آٹھ ساڑھے آٹھ تک یہ تین چار گھنٹے کا ٹائم ان کا اپنا ہے جو ان کی ادبی کاوشوں کے لیے وقف ہے۔ انھوں نے بالخصوص تحقیق و تدوین کے میدان میں اپنی جو شناخت قائم کی ہے وہ اسی سحر خیزی کے معمول کی دین ہے۔ دفتر کا

ٹائم ساڑھے نو بجے کا ہے، یہ نو اور سوا نو کے بیچ دفتر پہنچ کر اپنی میز سنبھال لیتے ہیں۔ اور اب شام تک دنیاداری ہوتی رہتی ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے چار خوش چار ناخوش۔ دفتر کے مسائل اور الجھیڑے الگ، اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت، بک ڈپو، انجمن کمپیوٹر سینٹر، قیصر تعلیمی مرکز، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، ملک بھر میں پھیلی ہوئی انجمن کی شاخوں کی خبرگیری، اُردو کے مسائل اور ان سے متعلق مطالبے، جیسے، جلوس اور تحریکیں غرض اتنی مصروف زندگی کہ خدا کی پناہ۔ اتنی مصروف زندگی میں آدمی کو تھوڑا بہت کامک ریلیف تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔ اس کامک ریلیف کا سامان بھی قدرت نے خود خلیق انجم کی ذات میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔

خلیق انجم تہذیب اور شائستگی کا مطلب بخوبی جانتے ہیں لیکن مختلف مراتب کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی طرح کی تہذیب کو برتنے کے وہ قائل نہیں۔ وہ شائستہ لوگوں کے ساتھ شائستہ، نیم شائستہ لوگوں کے ساتھ نیم شائستہ، یہاں تک کہ ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ناشائستہ تک بن کر دکھا سکتے ہیں۔ ان کی وضع اس معاملے میں بقول سید انشا یہ ہے:

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

یہ بڑی جرأت کی بات ہے جو ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ خلیق انجم ایک انتہائی مہذب انسان ہیں، اس بات کی گواہی دینے والے کچھ لوگ تو اس دنیا سے اُٹھ گئے جیسے کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مرزا محمود بیگ، پروفیسر محی الدین قادری زور۔ جو لوگ بفضلِ خدا ہمارے بیچ موجود ہیں ان میں اندر کمار گجرال، ڈاکٹر سروپ سنگھ، سید حامد، پروفیسر جگن ناتھ اور ڈاکٹر

راج بہادر گوڑ اس بات کے گواہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں خلیق انجم نے رسم عقیدت کو کج کلاہی اور بانکپن سے نبھایا ہے۔ ایسے لوگوں میں پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام، حیات اللہ انصاری اور پروفیسر مسعود حسین خاں شامل ہیں۔

خلیق انجم میں ظرافت طبع بھی بلا کی ہے۔ ان کی حس مزاح انتہائی تیز ہے جو ان کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے مل کر بڑے گل کھلاتی ہے۔ کوئی بھی برجستہ جملہ، کوئی زوردار پھبتی، کوئی انتہائی موزوں مذاق دوستوں کی محفل میں یا سیمناروں کے اسٹیج پر برملا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے اور پوری محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ تاہم خلیق انجم کو بذلہ سنج کہنے میں مجھے تھوڑا تامل سا ہے، ان کے مزاج کے اک گونہ پھکڑپن کے سبب۔ بذلہ سنجی تہذیبی سطح پر ایک ایسے مزاج کی متقاضی ہے جو پھکڑپن ذرا سا بھی برداشت نہیں کرتا۔ گویا بذلہ سنجی میں لطیف قسم کے تصنع کی بھی ہلکی سی رمق ہوتی ہے، اسی لیے بذلہ سنجی کا علاقہ بھی قدرے محدود ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی ظرافت طبع کو تو ایک بے کراں میدان چاہیے اور کھل کر بات کرنے کی ان کی طبیعت کو رواداری کی سپر سے زیادہ بے باکی کی تیغ کی ضرورت ہے۔ اور اس بے باکی کی انتہا ہے منہ پھٹ اور پھکڑ ہونا جو کبھی کبھی خلیق انجم کو ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال وہ براہ راست کبھی نہیں کرتے۔ وہ مجلسی خوش گپیوں کے حیلے سے یہ کام کر جاتے ہیں۔

میں کافی دیر سے اس مضمون کو اختتام پر پہنچانے کی فکر میں ہوں لیکن اس کی باگ میرے ہاتھ سے کب کی چھوٹ چکی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سب سے مشکل کام خلیق انجم کا خاکہ لکھنا ہی لگتا ہے اسی لیے میں اس کو اب تک ٹالتا رہا تھا۔ اگر خلیق انجم میرے لیے کوئی معروضی حقیقت ہوتا تو میں اسے ماڈل کی طرح اپنے سامنے بٹھا کر کب کا اس کا نقش اتار چکا ہوتا۔ لیکن ماڈل اور رول ماڈل میں جو فرق ہوسکتا ہے وہی فرق

خلیق انجم کی معروضی شخصیت اور اصلی خلیق انجم میں ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ اصلی خلیق انجم کیا ہے۔ تو اس اصلی خلیق انجم کی بھی کئی اصلیتیں ہیں، خود ان لوگوں کی اپنی اصلیتوں کے تعلق سے جن کے وجود میں خلیق انجم کسی نہ کسی طور سمایا ہوا ہے۔ تو میرے وجود میں بھی خلیق انجم پچھلے باون برسوں سے پوری طرح متھا ہوا ہے۔ میں اسے کسی مفرد اکائی کی شکل میں اپنے اندر سے باہر لا کر آپ کو دکھا ہی نہیں سکتا، اسی لیے تھوڑا تھوڑا سا کہیں کہیں سے کھرچ کھرچ کر باہر لا کر دکھانے میں لگا ہوں۔ اور یہ نظارہ میتھی کی روٹی کے اس گندھے ہوئے آٹے کے پیڑوں کی طرح ہے جہاں آٹا اور میتھی کا ساگ اپنے اپنے دو نمایاں سفید اور سبز رنگوں میں دیکھے تو جا سکتے ہیں لیکن انھیں علاحدہ علاحدہ کر کے نہیں بتایا جا سکتا۔

نامور جی

''نامور سنگھ (ولادت ۲۸ جولائی ۱۹۲۷ء) ہندی ادب میں بالخصوص اور ہندوستانی ادب میں بالعموم ایک انتہائی معروف نام ہے۔ وہ ہندی کے چوٹی کے نقاد ہیں۔ ان کا تعلق سجاد ظہیر، فیض اور ملک راج آنند کے بعد اردو، ہندی اور پنجابی کے ترقی پسند ادیبوں کی دوسری صف سے ہے۔ اردو دنیا ان سے اور وہ اردو دنیا سے یکساں طور پر متعارف ہیں۔ محمد حسین آزاد اور حالی کے معتقد، میر و غالب کے عاشق اور فیض کے مداح ہیں۔ نامور سنگھ اعلا پایے کے مصنف ہونے کے ساتھ زبردست خطیب اور بلا کے مجلسی انسان ہیں۔ اگرچہ ہندی کے ساتھ سنسکرت کے بھی عالم ہیں لیکن ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں گنگا جمنی لب ولہجہ اور آہنگ ہے۔ ان کی انتہائی دل چسپ اور مختلف الجہات شخصیت غیر معمولی خوبیوں اور بعض دل کش کمزوریوں کا مرقع ہے اور ہر اعتبار سے خاکہ نگاری کے لیے ایک جان دار موضوع ہے۔''

نامور سنگھ — اس نام پر غور کرتے ہوئے مجھے غالب کا ایک فارسی شعر یاد آرہا ہے جس میں غالب نے اپنے آپ کو 'نام آور' کہا ہے، اور ساتھ ہی اپنے نام 'اسد' کا بھی ذکر کیا ہے جس کا مطلب ہے شیر یعنی سنگھ۔ اس بات کا مقصد نامور جی کو غالب کے درجے تک لے جانا نہیں، میں تو دراصل یہاں اس ہلکی پھلکی سی دل چسپ مماثلت کا لطف لیتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتا ہوں جو غالب کے شعر اور نامور سنگھ نام کے مطلب کے بیچ ہے۔ میں انھیں ہندی کا حسن کہہ کر ہندی جگت کو بھی کسی ہڑبڑاہٹ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ نامور جی کا اپنی جگہ جو درجہ ہے وہ ہے۔ میری مشکل تو یہ ہے کہ میں حالی کے پاؤں کی دھول بھی نہیں اور نہ ہی باسویل کے ہاتھ کا میل۔ ایسی حالت میں نامور جی کی شخصیت پر قلم اٹھانا میرے لیے ایک ایسا دشوار مرحلہ ہے جو نہ حالی کے لیے غالب تھے اور نہ باسویل کے لیے جانسن۔ لیکن کسی مرحلے کے دشوار ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس سے جوجھا نہ جائے۔ اس لیے یہ مصرع پڑھتے ہوئے کہ ... 'مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا' میں اپنے سفر پر نکلتا ہوں۔ دعا کیجیے کہ اس سفر کے اختتام پر میں آپ کو صحیح سلامت ملوں۔

اگر کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے کئی دنوں تک اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آپ کی یہ حالت ہو کہ آپ یہی سوچتے چلے جا رہے ہوں کہ کہاں سے شروع کروں، کیسے شروع کروں اور کئی بار لکھنا شروع کرنے کا منصوبہ بنا کر میز پر بیٹھنے کے بعد بھی آپ لکھنے کا حوصلہ نہ پیدا کر پائیں اور کچھ اور پڑھنے بیٹھ جائیں تو اس سے ایک بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے موضوع پر چاہے اچھا برا جیسا بھی لکھ پائیں لیکن اس موضوع کے ساتھ آپ کا کوئی سچا رشتہ ضرور ہے۔ شیشے کے نازک اور قیمتی سامان کو ڈھونے میں جتنی احتیاط کی ضرورت ہے، اس سے کہیں زیادہ احتیاط اس سامان کو برتنے

میں چاہیے۔ موضوع کو ڈھونے والا قلم ہانکا لگاتے ہی بیل کی طرح ایک دم دوڑ پڑتا ہے۔ لیکن موضوع کو برتنے والا قلم تو پہاڑ کی چوٹی سر کرنے والے کی طرح راستہ بنا بنا کر ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ ایسے میں مجھ جیسے اناڑی قسم کے ادیب کی مشکل یہ ہوجاتی ہے کہ اس کے پاس قلم تو موضوع کو ڈھونے والا ہے لیکن اس میں امنگ ہے موضوع کو ڈھونے کے بجائے برتنے کی۔ موضوع کو ڈھونے والے قلم سے موضوع کو برتنے کا کام لینا اپنے آپ میں ایک دل چسپ تجربہ ہے جس میں اتفاق سے کسی نئے اسلوب کے پیدا ہوجانے کا امکان بھی چھپا ہوسکتا ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو اس میں لکھنے والے سے زیادہ کمال خود اس موضوع کا ہوگا۔ میرا بائی اگر مورتی کلا جانتی ہوتیں تو بھی شاید وہ کرشن کی مورتی کبھی بھی نہ بنا پاتیں۔ میری مشکل یہاں بھی کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں مورتی کلا نہیں جانتا اور دوسرے یہ کہ نامور جی میرے لیے ایسی کوئی شبیہ بھی نہیں جیسی میرا کے لیے کرشن تھے۔ بلکہ وہ تو گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان ہیں۔ جو فیض حاصل کرنے اور فیض پہنچانے کی مجموعی طاقت کے ساتھ میرے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہیں۔ جس طرح لوگ رام اور کرشن کو اپنی اپنی شردھا (عقیدت) کے مطابق انھیں اپنے لیے جو چاہے بنا لیتے ہیں اور وہ بیچارے مٹی کے مادھو بنے اپنے شردھالوؤں (عقیدت مندوں) کا صرف منھ ہی تکا کرتے ہیں، وہ میں نامور جی کے ساتھ نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ وہ کوئی شبیہ نہیں ہیں بلکہ ایک زندہ انسان ہیں۔ اور وہ باہمی رشتوں کے تیکھے پن کے ساتھ زندہ اور سلامت رہیں۔ یہ میری دعا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نامور جی کی تصویر بنانی شروع کرچکا ہوں۔ اور میرا پڑھنے والا جو نامور جی کی شخصیت سے ناواقف نہیں ہے، میری اب تک کی باتوں سے یہ جان

گیا ہوگا کہ مجھے اس وقت کس چیلنج کا سامنا ہے لیکن مجھ میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت اس لیے ہے کہ محدود اور لامحدود کا گٹھ جوڑ ہی میرے اور نامور جی کے بیچ رشتوں کی بنیاد ہے۔ اور یہاں میں پھر یہی کہوں گا کہ اس میں کمال میرا نہیں نامور جی کا ہے۔ وہ دانا ہیں لیکن ان کے اندر نادانوں کو بھی گلے لگانے کا حوصلہ ہے۔ عالم ہیں لیکن اَن پڑھوں کے سر پر بھی پوری خود اعتمادی کے ساتھ ہاتھ رکھ سکتے ہیں۔ دوستی ان کا دھرم ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ نبھانے کا فن وہ جانتے ہیں۔ انقلابی خیالات رکھتے ہیں لیکن ان حلقوں میں بھی انھیں وقار اور مرتبہ حاصل ہے، جہاں وی۔ پی سنگھوں، ڈنڈوتوں اور نورالحسنوں کا وجود ان کے لیے سانس لینے کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔

ٹھاکر نامور سنگھ کا سنگھ ہونا تو ان کے نصیب میں لکھا تھا اور نامور بنے وہ اپنے کرم سے۔ چوں کہ وہ مارکسی نظریات میں یقین رکھتے ہیں اس لیے وراثت میں ملی سنگھ نام کی دولت کا انھوں نے عملی زندگی میں ناجائز تو کیا کبھی جائز استعمال بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ماتھے پر سامنے والے کو خوش آمدید کہنے جیسی چمک ہے۔ باتوں میں بنارس کے لنگڑے آم کی سی کھٹی میٹھی چسک اور شخصیت میں رشتوں کی نرمی اور گرمی سے پیدا ہونے والی گدگداہٹ۔ ان کے خون پسینے کی کمائی ہے ان کی بے پناہ علمیت جس کے سبب وہ نامور ہیں۔ اس لیے اگر وہ سنگھ ہیں بھی تو صرف علم کی دنیا کے۔ جب وہ فرصت کے لمحوں میں بیٹھ کر غیر رسمی بات چیت کرتے ہیں تو پوری محفل بنارسی پتے کی مہک اور بابا کی تین سو نمبر کی زعفرانی پتی کی خوشبو کی لپیٹ میں ہوتی ہے اور جب وہ اسٹیج پر کھڑے ہوکر لکچر دیتے ہیں تو موسم کی پہلی گرج دار بارش کا سا وہ سماں ہوتا ہے جہاں ایک طرف بادل اور بجلی مل کر آسمان سے ویر رس برسا رہے ہوتے ہیں اور دوسری طرف بارش کی بوندوں کی کلبلاہٹ سے دھرتی سے مٹی کی سگندھ کا سوندھا سنگیت پھوٹ

رہا ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لکچر میں لہجے کی دھمک کے ساتھ ساتھ فکر اور فلسفے کی کھناہٹ بھی ہوتی ہے۔

پروفیسر نامور سنگھ کو میں ہندوستان کی اس رنگارنگ تہذیب کی علامت مانتا ہوں جسے تاریخ کی زبان میں ہندوستانی مغل تہذیب کہا جاتا ہے۔ آج میرے نزدیک اگر ہندی کا کوئی شناختی کارڈ ہے تو وہ پروفیسر نامور سنگھ ہیں۔ اور اس سیاق میں نامور سنگھ صرف ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک عظیم سوچ کا نام بھی ہے جو شاید اپنے عظیم ہونے کے سبب ہی سماج کو اپنے وجود کی خبر دینے کی ضرورت نہیں سمجھتی اور اپنی اسی الکساہٹ کے کارن برابر غیر موجود سمجھی جاتی رہی ہے۔ تلسی داس غریب کا غریب یا گریب، للوجی لال کے نام کا 'لال'؛ نامور سنگھ کے نام کا اصل حصہ 'نامور' اور ہندی بھاشا کا نام 'ہندی' یہ سب فارسی لفظ ہیں۔ اور یہاں زیادہ چھاننے میں کرکرا ہونے کا ڈر اس لیے نہیں کہ اگر ہم ماضی میں دور تک جھانک کر دیکھیں تو زبان کے ہند یورپی خاندان کا ایک موڑ وہ دکھائی دے گا جسے ہند ایرانی کے نام سے جانا جاتا ہے اور اسی سے آگے چل کر زبان کی دو نئی پیڑھیاں وجود میں آئیں، ایک ایرانی اور دوسری ہند آریائی۔

میں بھول نہ جاؤں اس لیے تھوڑا سا فلیش بیک میں جانے سے پہلے یہاں نامور جی کے بارے میں ایک بات اور کہتا چلوں۔ نامور جی کی ڈکشنری میں ناکامی جیسا کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ جس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھالیں، سمجھیے وہ ہوا رکھا ہے۔ لیکن نامور جی ہر کام کا بیڑا اتنی آسانی سے نہیں اٹھاتے جتنی آسانی سے وہ پان کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ کسی کام کا بیڑا اٹھانے یا نہ اٹھانے کا فیصلہ وہ اپنی کسی جیوتش ودیا کی بنیاد پر کرتے ہیں یا کچھ اور وجوہ سے، یہ ایک راز ہے اور ہر بڑے آدمی کی زندگی میں کسی نہ کسی راز کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۹۶۰ء کے دہے کے شروع کے سال تھے۔ دلی یونیورسٹی کی لائبریری کی بغل میں ایک بیرک میں وینگرز ریستوراں ہوا کرتا تھا۔ اس ریستوراں کے لان میں ہم لوگ اکثر جاڑے کی دھوپ میں گرم گرم چائے کی چسکیاں لیا کرتے تھے۔ وہیں ایک روز میں، میرے دوست ہربنس مکھیا اور ڈاکٹر خلیق انجم بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اچانک چھریرے بدن کے ایک صاحب ہماری میز کے پاس آکر رکے۔ یہ صاحب سفید دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے تھے، سر پر اس وقت ذرا اوپر کو اٹھے ہوئے گھنگھرالے سے کالے بال تھے اور منہ میں بنارسی پان گھلا ہوا تھا۔ اس پان کے رس کو منہ میں سنبھالے رکھنے کے جتن میں وہ آسمان کی طرف منہ اونچا کیے ہم زمین پر بیٹھے لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت کچھ جلدی میں تھے اس لیے انھوں نے کھڑے کھڑے ہی دو چار باتیں کیں اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئے۔ میں اپنے ترقی پسند خیالات کے باوجود کمیونیکیشن نہ ہونے کی وجہ سے پورب کے ان دھوتی دھاری جن کو راج رشی ٹنڈن اور سمپورنانند جی ہی کی قبیل کی کوئی چیز سمجھا۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد جب ہم نے مکھیا صاحب سے پوچھا کہ یہ صاحب کون تھے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ نامور سنگھ ہیں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور مارکسسٹ ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے اس تصور نے جس کی بنیاد دھوتی تھا، ایک دم، دم توڑ دیا۔ اور اب مجھے کچھ ایسا یاد آنے لگا کہ اس شخص میں جو ابھی یہاں سے اپنی ذرا سی جھلک دکھا کر گیا ہے، کوئی بات تو تھی جسے میں اس کی دھوتی میں الجھ جانے کے سبب فوری طور پر محسوس نہیں کر پایا اور پھر اپنے دھوتی کی بنیاد والے تصور کے دم توڑنے کا جشن میں نے اپنی تخیلاتی دنیا میں اس طرح منایا کہ کئی بار نامور سنگھ کی دھوتی مولانا حسرت موہانی کو پہنائی اور اتنی ہی بار حسرت موہانی کی داڑھی نامور سنگھ کے چہرے پر لگا کر 'غلبۂ آئین سوویت' کا جلوہ دیکھتا رہا۔ یہ تھا نامور جی کے

ساتھ میرا پہلا تعارف۔ اس کے بعد انھیں وینگرز میں مختلف لوگوں کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے کئی بار دیکھا لیکن دراصل ان کے قریب آنے کا موقع پہلی نومبر ۱۹۷۴ء کو اس وقت ملا، جب ہم جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ایک ہی شعبے کے دو ساتھیوں کے روپ میں ایک دوسرے سے ملے۔ آج ان تعلقات کو لگ بھگ ایک چوتھائی صدی ہونے کو آئی۔ یہ کوئی تھوڑی مدت نہیں۔ اس عرصے میں ایک جان کیٹس انگریزی شاعری کی تاریخ میں اپنی شہرت کا ڈنکا پیٹتا ہوا پیدا ہو کر مر بھی چکتا ہے۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی ہندوستانی زبانوں کا مرکز بھی اپنی طرح کا ایک ہی ہے۔ اس مرکز کا تصور، ان کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ پروفیسر مونس رضا کے ذہن کی اپج تھا۔ اور ان کے اس تصور کا مرکزی نقطہ تھے، پروفیسر نامور سنگھ جنھیں ہندوستانی زبانوں کے مرکز کا پہلا صدر بنا کر جودھ پور یونی ورسٹی سے یہاں بلایا گیا تھا۔ کسی یونی ورسٹی میں یہ ہندی اور اردو کا پہلا ملا جلا شعبہ تھا جہاں ایک تو اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندی اور اردو کے اساتذہ کھلے دل اور دماغ کے لوگ ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کے دلوں کے پار اترنے کی کوشش کریں۔ پھر اس طرح جو ماحول بنے، اسی کے پالنے میں ہندی اور اردو کے طالب علم مل کر جھولا جھولیں۔ یہ ایک ایسی مہم تھی جس میں نیاپن تو تھا ہی، بے پناہ تازگی بھی تھی، اور ایک زبردست چیلنج بھی۔ اس پہاڑ کو ہنومان کی سی شکتی کے ساتھ ہتھیلی پر لے کر چلنے والے تھے نامور سنگھ اور ان کے پیچھے پیچھے صدیق الرحمٰن قدوائی، شریمتی ساوتری چندرا اور یہ ناچیز۔ لنکا فتح کرنے والوں کی اس فوج میں دیکھتے ہی دیکھتے دو ہی برس کے اندر ایک کے بعد ایک جو اور نام شامل ہوئے، وہ تھے بی.ایم. چنتامنی، سوم پرکاش سدھیش، محمد حسن، کیدار ناتھ سنگھ اور منیجر پانڈے۔ صحیح معنوں میں ہندوستانی

زبانوں کے اس مرکز کا ابتدائی دور ہی اس کا سنہرا دور تھا۔ رامائن کی کتھا میں بھی لنکا کی وجے کے بعد کا اگلا ادھیائے تو سیتا کی اگنی پریکشا کا ہی ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے سنہرے دور میں جو روایت قائم ہوئی اس کا تھوڑا سا ذکر یہاں ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس روایت کی بنیاد تو نامور جی ہی نے ڈالی تھی، بعد میں عمارت کھڑی کرنے والوں میں بھی شامل تھے۔

تھیوری آف لٹریچر سے متعلق لگ بھگ چالیس فیصد کورس ایم۔اے اور ایم.فل ہندی اور اردو کے درمیان مشترک تھے۔ داخلے کے وقت ہندی اور اردو کے طلبہ کا انٹرویو ایک ساتھ ہوتا تھا، جس میں مرکز کی ہندی اور اردو کی پوری فیکلٹی ہوتی تھی اور سبھی پوچھ تاچھ میں حصہ لیتے تھے۔ ہندی اور اردو کے امتحان کے پرچوں اور کاپیوں پر فیکلٹی میٹنگ میں ہی بات چیت ہوتی تھی، اور امتحان کے نتیجوں کو بھی ہم سب مل کر ہی آخری شکل دیتے تھے۔ ہندی اور اردو کے مشترکہ کورسوں کی کلاسیں بھی ایک ساتھ ہوتی تھیں، جنھیں یا تو کوئی ہندی کا استاد پڑھاتا یا اردو کا۔ اس طرح کی کلاسوں میں ہندی کے اساتذہ کو مشکل ہندی کے لفظوں کے اور اردو کے اساتذہ کو مشکل اردو کے لفظوں کے استعمال کے بارے میں احتیاط سے کام لینا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایم۔اے. ہندی کے طالب علموں کے لیے اردو کا ایک کورس اور ایم۔اے. اردو کے طالب علموں کے لیے ہندی کا ایک کورس لازمی قرار دیا گیا۔ مجھے بھی لگ بھگ سات آٹھ سال ایم۔اے. کا ایک مشترکہ کورس پڑھانے کا موقع ملا۔ اس کورس کا نام تھا 'ہندی اور اردو میں کھڑی بولی کا ارتقا'، اس کورس کو پڑھانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اردو کے بارے میں ہندی کے طالب علموں کے اور ہندی کے بارے میں اردو کے طالب علموں کے کچھ بنے بنائے نظریات اس کورس کے ذریعے ٹوٹتے تھے، دوسرے یہ کہ چوں کہ یہ کورس میں پڑھاتا تھا

جو اردو کا استاد تھا اس لیے ایک طرف تو میرے ذریعے ہندی کے طالب علم اردو کے کچھ لفظوں کا مطلب اور استعمال سیکھتے تھے، دوسری طرف اپنے انھی ہندی کے طالب علموں کے ذریعے میں بھی ہندی کے بہت سے لفظوں کا مطلب اور ان کا استعمال سیکھتا چلا گیا۔

نامور جی بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر اتنا کچھ پڑھ رکھا ہے اور برابر پڑھتے رہتے ہیں کہ جس کا حساب نہیں لیکن ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر زندگی، سماج، ادب اور سیاست کے چھوٹے بڑے معاملوں پر وہ لیاقت جھاڑنے کے بجائے سیکھنے سکھانے کی سطح پر بات چیت کرتے تھے۔ نامور جی نے کسی بھی بات چیت میں ہم پر اپنے علم کو تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ اصل میں ایسا کچھ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے، لوگ کرتے ہیں جن کے پاس بس کچھ گنے چنے منتر ہوتے ہیں۔

اردو کے بے شمار ادیبوں کے ساتھ ان کے اپنے خاص مزاج کے سبب اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعے بھی نامور جی کے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ اردو ادب کی باریکیوں کو جتنا نامور جی سمجھتے ہیں ایسے شاید ہندی میں چند ہی لوگ ہوں گے۔ اور اردو والوں میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو شاید اردو کے بارے میں اتنا نہ جانتے ہوں۔ میر اور غالب جیسے شاعروں کا نہ صرف انھوں نے غائر مطالعہ کیا ہے بلکہ انھیں اچھی طرح رچایا بچایا بھی ہے۔ آج کے دور کے اردو ادب سے بھی وہ پوری طرح واقف ہیں۔ ایسے بہت سے کام ان کی نگرانی میں ہوئے ہیں جہاں اردو ادب کے ایک بہت بڑے حصے کو ہندی میں شائع کیا گیا ہے، خاص کر جہاں تک میں جانتا ہوں راج کمل پرکاشن کی ایسی بہت سی اسکیموں میں سیدھا سیدھا نامور جی کا ہاتھ ہے۔ ادب کے ساتھ نامور جی کی دل چسپی صرف ہندی یا اردو ادب تک ہی محدود نہیں، وہ تو پورے عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ نامور جی کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ پڑھا

ہے، اس سے کچھ کم بولا ہے اور اس سے بھی کم لکھا ہے۔ یہ بات تو نامور جی جانتے ہیں کہ بولنا عصر حاضر تک محدود رہتا ہے اور لکھنا آنے والے وقت کے ساتھ بہت دور تک جاتا ہے۔ اگرچہ آج کل الکٹرانک میڈیا کے زمانے میں بولے ہوئے کو لکھے ہوئے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن میرے نزدیک ایسی تحریر ادیب کے جعلی دستخط یا اصلی دستاویز کی فوٹو کاپی کے مصداق ہے۔ اصل لکھنا تو وہی ہے جو قلم پکڑ کر ہوتا ہے۔ ادیب کی صلاحیت کا ایک بہت بڑا خزانہ اس کے قلم کی روشنائی میں بھی ہوتا ہے۔ اور بولا ہوا چاہے وہ جتنا ہی زوردار ہو، قلم کی روشنائی کے رنگ سے بہرحال محروم رہتا ہے۔ اورل یا زبانی روایت کے زمانے تک شاید قلم کی روشنائی کی تاثیر بھی بولنے ہی میں شامل تھی لیکن پڑھنے لکھنے کے وجود میں آنے کے بعد بولنا دو حصوں میں تقسیم ہوگیا، زبان سے بولنا اور قلم سے بولنا۔ اس طرح قلم نے اس تقسیم سے پہلے کے بولنے کا کچھ رنگ چرا کر اپنی روشنائی میں بھرلیا۔ لیکن میں یہاں نامور جی کی عظمت کو کوئی صلاح دینے کی حماقت نہیں کررہا بلکہ خود اپنے آپ سے اونچے سروں میں بات کررہا ہوں۔ میرے خیال میں نامور جی کے کم لکھنے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو شاید وہ یہ سوچتے ہیں کہ لکھنا اسی وقت ضروری ہے جب وہ بولنے سے زیادہ کاٹ دار ہو، اور دوسرا یہ کہ وہ مستقبل کی اقلیم میں کوئی بہت ہی نپا تلا قدم رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ دراصل ان کی مثال حسن کے اس پجاری کی سی ہے جس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی کش مکش میں گزر جاتا ہے کہ حسن کی کس مورتی پر جان دوں، اور کس پر نہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ کنوارا کا کنوارا ہی رہ جاتا ہے۔ حالاں کہ نامور جی ایسے کنوارے بھی نہیں۔ اگر اس معاملے میں وہ کچھ کنوارے ہیں بھی تو اس رئیس جاگیردار کی طرح کے جو کنوارا ہوتا بھی ہے تو صرف رسمی طور پر۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کا ہندوستانی زبانوں کا مرکز اپنے سنہرے دنوں میں

صرف تعلیم ہی کا مرکز نہیں تھا، اس کا ایک تہذیبی روپ بھی تھا۔ اور اس روپ کی ریکھائیں بنانے والے بھی نامور سنگھ ہی تھے۔ بعد میں اس تصویر میں رنگ تو سب ہی نے بھرا۔ مرکز میں استاد، طالب علم اور دفتر کے لوگ مل کر سال میں دو تہوار بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے: عید ملن اور ہولی ملن۔ عید ملن پر ہم لوگ سویاں کھاتے اور موسیقی کا پروگرام کرتے۔ اس پروگرام میں ہندی کے طالب علم اور طالبائیں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ مجھے یاد ہے کہ مرکز کے سب سے پہلے عید ملن کے پروگرام میں ہندی کی کئی لڑکیاں غرارے پہن کر آئی تھیں جو انھوں نے اسی موقع کے لیے سلوائے تھے۔ اسی طرح ہولی ملن کے موقع پر بھی ہم لوگ کھاتے پیتے اور گاتے بجاتے اور ایک دوسرے کے گلال لگاتے تھے۔ نامور سنگھ جیسے مصروف آدمی کو ان کاموں کے لیے پوری فرصت تھی۔

سب جانتے ہیں کہ نامور جی سنگیت کے عاشق ہیں۔ وہ گانے اور بجانے کے ہر طرح کے سنگیت کے شیدائی ہیں جس میں غزل گائیکی اور قوالی تک شامل ہیں۔ وہ فلم، ناٹک اور رقص کے بھی اتنے ہی رسیا ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں وہ عام طور پر بہت خشک اور روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔ لیکن نامور جی کو کتاب کا کیڑا کہنا شاید ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کتاب کا کیڑا تو کتاب کو چاٹ چاٹ کر چھلنی کر دیتا ہے اور کیڑا کا کیڑا ہی رہتا ہے۔ نامور جی کا معاملہ یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ انھیں نہ تو کسی بوجھ تلے دباتا ہے اور نہ ہی کسی ایسے ذہنی تناؤ میں ڈالتا ہے جہاں آدمی پتھر ہضم کرنے کی سی مشکل میں پڑ جائے۔ نامور جی کے علم کا ایک اہم وسیلہ کتاب تو ہے ہی لیکن ان کی بات چیت میں کتاب کا ننگا ناچ نہیں ہوتا۔ نامور جی کا رشتہ کتابوں کے ساتھ وہی ہے جو کرشن کا گوپیوں کے ساتھ تھا۔ کرشن گوپیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے اپنی شوخی کی دھار بھی تیز کر لیتے ہیں اور گوپیوں کا روپ سروپ بھی وہیں کا وہیں رہتا

ہے، اور پھر کرشن کی یہ شوخی پک پک کر کرم یوگ بن جاتی ہے۔ نامور جی کتابوں سے اتنا ہی رس لیتے ہیں جتنا وہ فنون لطیفہ سے، دوستیوں اور رشتوں سے اور بنارسی پان سے لیتے ہیں۔ وہ جتنے سنجیدہ قاری ہیں اتنے ہی بیدار مغز ناظر بھی ہیں۔ ان کے اندر کا قاری ان کے اندر کے ناظر کا اور ان کے اندر کا ناظر ان کے اندر کے قاری کا ایک اٹوٹ انگ ہے۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے اور شاید اسی کو ہندی میں آچاریہ ہونا کہتے ہیں۔

ادب کی تاریخ تنقید کی تاریخ سے پرانی ہے۔ تنقید تو بعد میں ادب کے ایک بائی پروڈکٹ کی شکل میں وجود میں آئی۔ آہستہ آہستہ آج تنقید وہاں آ پہنچی ہے جہاں ادب اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تنقید کا دوسرا اہم رشتہ وہ ہے جو تنقید کا خود نقاد کے ساتھ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ادب کا سوال بیچ میں آنے سے پہلے ایک تصادم خود تنقید اور نقاد کے درمیان جاری رہتا ہے۔ کوئی بھی تصادم ہمیشہ دو زاویہ ہائے نگاہ کے سبب ہوتا ہے۔ اس طرح تنقید اور نقاد کے مابین تصادم سے بھی دو چیزیں سامنے آتی ہیں، ایک تنقید کی ادبی اساس اور دوسری ادب کا تنقیدی روپ۔ اس طرح نقادوں کی ایک قسم تو وہ ہوئی جہاں نقاد ادب کا مطالعہ بنیادی طور پر ادب ہی کی حیثیت سے کرتا ہے، اس طرح وہ ادب کے مطالعے سے نہ صرف خود کو محظوظ کرتا ہے بلکہ اپنی تنقید کی اساس ادب کو بنا کر اس میں بھی تازگی پیدا کرتا اور نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ادب کا دیپ ہاتھ میں لے کر تنقید کے اندھیرے غار میں قدم رکھتا ہے جس سے یہ غار روشن ہوتا ہے۔ اسی کو میں نے تنقید کی ادبی اساس کہا ہے اور نامور جی کو میں نقادوں کے اسی قبیلے میں شمار کرتا ہوں۔ نقادوں کی دوسری قسم وہ ہے جہاں نقاد ادب کا مطالعہ ادب کی حیثیت سے نہیں تنقید کے ایک موضوع کی حیثیت سے کرتا ہے اور 'میکینکل' انداز میں بندھے ٹکے فارمولوں کی بنیاد پر ادب کے بارے میں فتوے جاری

کرتا ہے۔ ادب کی اس تنقیدی تعبیر کو آپ مہذب زبان میں کلیشے کہہ سکتے ہیں جو ایک
طرح سے ادب کی آبروریزی ہے۔ نامور جی جیسے نقادوں کا ایک بڑا کارنامہ تنقید کے سر
پر ادب کا تاج رکھنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ ادب کی اس آبروریزی کے خلاف بھی
آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فکشن کے ایک سیمنار میں
مادام بواری کے سلسلے میں جاری ایک بحث میں نامور جی کو اس آبروریزی کی دھجیاں
اڑاتے دیکھا ہے۔

نامور جی کو آدمی کی زبردست پہچان ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ کس شخص پر بھروسہ
کیا جاسکتا ہے اور کس پر نہیں۔ وہ آدمی کی لیاقت کو بھی ایک نظر میں آنک لیتے ہیں۔ وہ
ہر شخص سے وہی کام لیتے ہیں جس کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ اس کام کو خوبی سے
پار لگا سکتا ہے۔ جب میں دلی کالج سے نیا نیا جواہر لال یونی ورسٹی آیا تو اس کے کچھ دن
بعد نامور جی کی ملاقات ڈاکٹر ہلدر سے ہوگئی جو اس وقت دلی کالج کے وائس پرنسپل تھے۔
ڈاکٹر ہلدر مجھ سے کچھ زیادہ ہی خوش تھے، اس لیے انھوں نے نامور جی سے میری اتنی
تعریف کردی کہ آج اکیس برس بعد بھی اس تعریف کا رنگ پھیکا نہیں پڑا ہے۔ ڈاکٹر
ہلدر سے نامور جی کو یہ بھی پتا چل گیا کہ اسلم پرویز پڑھاتا چاہے جیسا بھی ہو لیکن آدمی
ذمہ دار ہے اور پڑھانے کے علاوہ بہت سے تنظیمی کاموں میں بھی جی لگا کر حصہ لیتا
ہے۔ بس پھر کیا تھا، نامور جی نے مرکز کے ٹائم ٹیبل اور امتحانات کا بکھیڑا میرے حوالے
ایسا کیا کہ پھر یہ دونوں میٹھے آم چوستے ہوئے مجھے آج پورے اکیس برس ہوگئے ہیں۔
اگرچہ میں اردو کا استاد تھا لیکن نامور جی نے مجھے ایسے بھی کئی کام سونپے جو براہ راست
ہندی سے متعلق تھے، اور اکادمک سطح کے کام تھے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ایسے
بہت سے کاموں کو میں نے جانے کیسے کامیابی کے ساتھ پورا کیا اور اپنے بارے میں

نامور جی کے اعتماد پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ ایسے بہت سے کاموں کی تفصیل کی یہاں
ضرورت نہیں۔ نامور جی جب کوئی ایسا کام میرے سامنے رکھتے تھے جس کے بارے میں
پہلے پہل مجھے سوچنا پڑتا تھا کہ میں اسے کیسے پورا کروں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ نامور جی
بھینس کے آگے بین بجانا تو کیا، بھینس سے بین بجوانے کا جتن کر رہے ہیں اور میں نے
اپنے بارے میں نامور جی کے اعتماد کے چمکار کے ذریعے کئی بار بین بجا کر دکھا بھی
دی۔ گویا میری مثال اس گھوڑے کی سی ہے جس کا مالک تو یہ جانتا ہے کہ یہ ایک وفادار
اور طاقت ور جانور ہے، لیکن گھوڑا اپنے بارے میں خود نہیں جانتا کہ وہ وفادار ہے اور یہ
کہ اس کے پاس ہارس پاور بھی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اردو کے استاد کی حیثیت
سے میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں آیا تو تھا ریس کا گھوڑا بننے لیکن ہوکر رہ گیا
ریڑھے کا ٹٹو۔

مرکز میں برسوں ہمارا یہ دستور رہا کہ ہم لوگ دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے
تھے۔ لنچ کی یہ بیٹھک کوئی ڈیڑھ گھنٹے چلتی۔ نامور جی، صدیق الرحمٰن قدوائی اور میں اس
بیٹھک کے مستقل ممبر تھے۔ کبھی کبھی مرکز کے دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہوجایا
کرتے تھے۔ اس بیٹھک میں ہر طرح کے موضوعات پر بات چیت ہوتی تھی اور جہاں
تک مجھے یاد ہے، کسی بھی دن یہ بیٹھک بوریت میں نہیں بدلی۔ اس لیے کہ یہاں کبھی
بھی 'اور سنایئے' کی نوبت نہیں آئی اور لنچ کی ان بیٹھکوں سے زیادہ حسین اور یادگار وہ
لمبی شامیں ہیں جو نامور جی، کیدار ناتھ سنگھ اور صدیق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ زیادہ تر
نامور جی کے گھر پر اور کبھی کبھی کیدار ناتھ سنگھ کے گھر پر گزریں، پھر چلتے چلتے یہ شامیں
اشفاق محمد خاں کی دہلیز تک جا پہنچیں، لیکن یہ قصہ سیتا کی اگنی پریکشا کے دور کا ہے۔

ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔ نامور جی دو بار

ہندوستانی زبانوں مرکز کے صدر رہے اور ایک بار اسکول آف لینگویجز کے ڈین بھی، اس کے علاوہ فیکلٹی کے سب سے سینیر رکن تو تھے ہی، لیکن مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی بھی کسی کام سے مجھے اپنے آفس میں بلایا ہو۔ ہم خود جاکر ان کے پاس بیٹھ گئے ہوں وہ علاحدہ بات ہے۔ کوئی بات کرنی ہوتی تھی تو نامور جی خود چل کر میرے کمرے تک آتے تھے۔ ایک آدھ بار یہ بھی ہوا کہ انھوں نے میرے کمرے کا ذرا سا پٹ کھولا، دیکھا کہ کلاس ہورہی ہے، بنا ڈسٹرب کیے فوراً ہی الٹے قدموں لوٹ گئے۔ جن لوگوں کو نامور جی سے نزدیکیاں حاصل نہیں رہیں، ان سے میں یہی کہہ سکتا ہوں:

"افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی"

نامور سنگھ ایک مہذب انسان ہیں۔ ان کے نام کا سنگھ تو صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم کے میدان میں وہ شیر ہیں تو زندگی کے باقی معاملے میں بالکل بکری جیسے۔ یعنی ان کے وجود میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اکادمک سطح پر انھوں نے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں تو دوسری طرف انتظامی معاملوں میں کچھ غلط فیصلوں کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ اس معاملے میں میرے دوست صدیق الرحمٰن قدوائی اور نامور جی میں فرق یہ ہے کہ صدیق الرحمٰن قدوائی میں غلط فیصلوں کو ہونے سے روکنے کی طاقت نہیں اور نامور جی اکثر مروّتوں کی سودے بازی میں غلط فیصلوں کے سر سے اپنی طاقت کی تلوار ہٹا لیتے ہیں۔ اور اب تو گنگا سے اتنا پانی بہہ چکا ہے کہ صدیق الرحمٰن قدوائی کو شکتی مان اور نامور جی کو شکتی وادی بنا بھی دیا جائے تو کوئی فائدہ نہیں۔

نامور جی میری نظر میں ان گنے چنے عالموں اور پروفیسروں میں ہیں جنھوں نے شہرت اور عہدے حاصل کرنے کے لیے کوئی گھٹیا قسم کی سیاست کبھی نہیں لڑائی، انھیں جو

کچھ ملا ہے صرف ان کی لیاقت کے بل پر۔ کھیتی باڑی کے نئے نئے طریقوں کا استعمال اب صرف زرعی صنعت تک محدود نہیں رہ گیا ہے، تھوڑی سی زمین سے حد سے زیادہ پیداوار جیسا کرشمہ اب سماج کے ہر شعبے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ریزرو بینک کے پاس جتنا سونا ہے، اس سے زیادہ کے اس کے پاس کرنسی نوٹ چھپے رکھے ہیں۔ عام آدمی کے پاس پہننے کو جتنے کپڑے ہیں اس سے زیادہ منڈی میں کپڑے دھونے کے صابن موجود ہیں۔ شادی بیاہ کے آس پاس جتنے کنگلے جھوٹن پر منڈلاتے رہتے ہیں، اس سے زیادہ جھوٹا کھانا پھینکنے کو موجود ہے۔ اسی طرح اکادمک جگت میں 'پروفیسر ایمریٹس' کا پودا بھی پہلے کے مقابلے میں خاصا پھولنے پھلنے لگا ہے۔ پھر بھی یہاں پیداوار ابھی کچھ کم ہی ہے۔ اور ابھی بھی یونی ورسٹیوں میں پروفیسر ایمریٹس گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ساٹھے پاٹھے پروفیسروں کے لیے شدید تشویش کا باعث ہے۔ میرے نزدیک 'پروفیسر ایمریٹس' کی دو قسمیں ہیں۔ 'ایک سیاسی اٹھا پٹخ والا 'پروفیسر ایمریٹس' جو یہ عہدہ خون پسینہ ایک کرکے 'محنت' سے حاصل کرتا ہے اور پتھر میں جونک لگانے کے محاورے کو سچ کر دکھاتا ہے، دوسرا ہے اکادمک 'پروفیسر ایمریٹس' جسے یہ عہدہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گھر بیٹھے بٹھائے حاصل ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے "مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ"، نامور جی دوسری قسم کے 'پروفیسر ایمریٹس' ہیں۔ پروفیسر ایمریٹس کے عہدے کی بنیاد پر ایک پروفیسر کے نام ور کہلائے جانے اور دوسرے کے نام ور ہونے میں جو فرق ہے اس کی یہاں وضاحت کرنا گویا سی۔اے۔ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلی کہنے کے مترادف ہوگا۔

بہت سے لوگوں کو روپے کمانے اور سرمایہ جوڑنے کی اتنی ہوس ہوتی ہے کہ وہ ہر اس کام یا پیشے کو جس میں وہ ہوتے ہیں، شیئر مارکیٹ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہماری یونی

ورسٹیوں میں بھی ایسے پروفیسروں کی کمی نہیں جو کسی بھی بھاؤ اور کسی بھی منڈی میں خود کو تھوک یا پرچون میں بیچنے اور بھنانے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کی مصروفیتوں کا یہ عالم ہے کہ ان بیچاروں کو استاد کا فرض نبھانے کا موقع ہی کم سے کم ملتا ہے۔ دراصل یو.جی.سی.، یو.پی.ایس.سی.، این.سی.ای.آر.ٹی. اور ملک کی ساری یونی ورسٹیوں نے اور دوسری تنظیموں نے ان پروفیسروں کو مختلف کاموں اور کمیٹیوں میں اس بری طرح جوت رکھا ہے کہ یہ بیچارے بھی کیا کریں۔ کلاس کا کیا ہے وہ تو ریڈر اور لیکچرر بھی پڑھا سکتا ہے اور عام طور پر اسی کو اس کام کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اکادمک سطح کی اعلا درجے کی کلرکی کے لیے تو پروفیسر سے کم کام چل ہی نہیں سکتا، اس لیے صرف سرپھرے پروفیسروں کو چھوڑ کر زیادہ تر پروفیسر اپنی سی۔ آر میں ستارے ٹانکنے کے لیے یہ کام چلانے کو تیار رہتے ہیں۔ نامور جی کا حال یہ ہے کہ شہرت اور لیاقت کے معاملے میں وہ اگرچہ ایک قطب مینار ہیں لیکن پیشے کے اعتبار سے وہ نرے ماسٹر کے ماسٹر ہی رہے۔ حالاں کہ یونی ورسٹی سے باہر وہ بھی کبھی کم مصروف نہیں رہے ہیں لیکن استاد کا رول نبھانے کے معاملے میں بھی وہ ہمیشہ اس قدر پابند رہے ہیں کہ انھوں نے پکی نوکری کی منزل کی طرف دوڑنے والے اچھے اچھے پارٹ ٹائم اور کچی نوکری والے استادوں کو بھی مات کر دیا۔ اور وہ کیسے استاد ہیں، اس پر تبصرہ کرنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔

دلّی کی بڑی بوڑھیاں جب کسی کی تعریف کرنا چاہتی ہیں تو پہلے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہتی ہیں، ''بوا بے عیب ذات بس اللہ کی ہے''۔ یوں بھی کسی بھی شخص میں خوبیاں تلاش کرنے سے کہیں زیادہ آسان کام اس میں برائی ڈھونڈ نکالنا ہے۔ یہ کام تو اس شخص کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق ہوئے بنا بھی کیا جا سکتا ہے۔ گمنام لوگوں کا شجرۂ نسب ان کے صندوق میں بند رہتا ہے، جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس نام ور لوگوں کا شجرۂ

نسب بیشتر لوگ اپنی بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ کچا چٹھا اسی لیے بھی کچا چٹھا ہوتا ہے کہ وہ کچی روشنائی سے لکھا ہوتا ہے۔ تاریخ ایسے چٹھوں کو دستاویز کا درجہ نہیں دیتی، وہ صرف پکی روشنائی کو مانتی ہے۔ آپ اگر پورے تاج محل کی جھاڑو دینے کھڑے ہو جائیں تو یقیناً ایک ٹوکرا گندگی سمیٹ لائیں گے لیکن تاج محل تو وہیں کا وہیں رہے گا۔ ہاں گھر آ کر خود آپ کو کپڑے بدلنے پڑ سکتے ہیں اور پھر ہم تو اس رسمی تعلیم کی منزل سے گزر کر چھوٹے سے بڑے ہوئے ہیں۔ جہاں سو میں سے چھیاسٹھ نمبر کھو دینے والا امیدوار بھی پاس ٹھہرتا ہے اور نامور جی تو کہیں نوے سے اوپر والوں میں آتے ہیں۔ جو جے.این.یو کے گریڈ سسٹم کی بنیاد پر 'اے پلس' اور اگر کہیں پچانوے کو چھو جائے تو راؤنڈ آف ہو کر 'او' یعنی آؤٹ اسٹینڈنگ ہو جاتا ہے۔ نامور جی کی شخصیت پر یہی گریڈ سجتا بھی ہے، بھلے ہی امتحان کے حساب کی رسم انھیں سو میں سے سو نہ دے۔ کسی غیر معمولی شخصیت کا قلمی چہرہ بنانے کے لیے لکھنے والے کو پہلے اس شیر کو پنجرے میں بند کرنا پڑتا ہے، پھر اس پنجرے کے باہر کاغذ اور قلم لے کر بیٹھنے کے ساتھ لکھنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ جب تک شیر پنجرے میں ہے آپ کا قلم آزاد ہے۔ چاہیں تو قلم سے شیر کے ساتھ تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ بھی کر سکتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ اس آزادی کا استعمال سنبھال کر کیا جائے، اس لیے کہ آپ کی تحریر ختم ہوتے ہی شیر کا یہ پنجرہ آپ ہی آپ کھل جائے گا اور پھر شیر باہر۔ اسی کے ساتھ میری یہ تحریر بھی ختم ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پنجرے سے باہر آتا ہوا شیر اپنے رنگ ماسٹر کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

نامور سنگھ کا خط بیٹی کے نام، انھی کی بھاشا میں

بچ مڑھی

۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء

میری پیاری بلّو!

پتا نہیں تمھیں آج ہچکیاں آئیں یا نہیں، لیکن مجھے تو آج صبح سے ہی تمھاری یاد آتی رہی۔ "یاد آتی رہی" کہنا غلط ہوگا، سچ تو یہ ہے کہ تم میری یاد کے ساتھ چپکی رہیں، مکھی کی طرح — بھنبھناتی بھی رہیں اسی کی طرح۔ اب پوچھو کیوں؟ "مکھی" کہنے پر لڑو مت، تو جواب دوں۔

بات یہ ہوئی کہ آج دن بھر جنگلوں، پہاڑوں، جھرنوں، گپھاؤں کا چکر لگاتے رہے۔ یعنی پریٹکوں (سیاحوں) کے لیے پچ مڑھی میں دیکھنے لائق جو جگہیں بتائی گئی ہیں، انھیں دیکھتے رہے۔ ایک جیپ میں لدے پھندے کوئی بارہ آدمی جن میں تین چار جانیں مجھ سے بھی عمر میں آٹھ دس سال زیادہ اور سب سے چھوٹے رام بخش لیکن سب سے زیادہ سنجیدہ بھی وہی۔ اب ایسی منڈلی میں مجھے تمھاری یاد نہ آئے تو کیسے نہ آئے۔ گو اونچی نیچی، اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں پر بھی کافی چلنا پڑا۔ سینکڑوں فٹ کی چڑھائی اور اترائی۔ تم ہوتیں تو رو دیتیں۔ یعنی ہنستے ہنستے رو دیتیں۔ لیکن مزہ آجاتا۔ غرض کہ پچ مڑھی دیکھنے لائق جگہ تو ہے۔ کم سے کم ایک بار تم ساتھ ہو تو دوبارہ بھی۔

واکیہ (جملہ) پورا کرتے کرتے ابھی میاؤں کی آواز سنائی پڑی۔ دیکھتا ہوں تو ادھ کھلے کمرے کے دروازے سے ایک پیاری سی بلی جھانک رہی ہے، کالی سفید چتکبری، یہ بلی اس ہوٹل کی ہے، گلیاروں میں اکثر دِکھ جاتی ہے۔ صبح صبح "گڈ مارننگ" بھی کرتی ہے۔ لیکن کمرے میں آج ہی آئی۔ کیوں؟ کیا کچھ پوچھنا چاہتی ہے؟ پتا نہیں تم ہوتیں تو دو بھاشیے سمسیا (ترجمانی کا مسئلہ) حل ہوجاتی۔ اب صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ کیسا لگا پچ مڑھی؟ کیسی رہی آج کی سیاحت؟

ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور پوچھتی ہو کیسا رہا؟ بتانے کی طاقت تو تب آئے جب کوئی

پاؤں دباتا، — "کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا" — بتانے کے لیے میرا [illegible] پیٹ نہیں پھول رہا ہے۔ بتانے لائق کچھ ایسا ہے بھی نہیں۔ لیکن کچھ نہ کہوں تو اس [illegible] مڑھی کا اپمان (بے عزتی) ہوگا۔ اب تمھیں بتاؤ، کوئی اپنی کویتا یا کہانی سنائے اور میں [illegible] کر خاموش رہ جاؤں تو اسے کیسا لگے گا؟ آلوچک (نقاد) ہوجانے کی یہ سزا تو بھگتنی [illegible] پڑے گی۔ قسمت میں یہی لکھا ہے۔ بہرحال یہاں مہادیو بہت ہیں۔ مہادیو نام کی [illegible] جگہ بھی ہے۔ دس کلومیٹر دور وہاں سے ڈیڑھ کلومیٹر پر ایک گپت (پوشیدہ) مہادیو ہیں۔ گپت تو پہلے والے مہادیو بھی ہیں، لیکن دوسرے والے کچھ زیادہ گپت ہیں۔ دوسری [illegible] (سمت) میں ایک اور مہادیو ہیں جو جٹاشنکر کہلاتے ہیں۔ یہ بھی گپت ہیں۔ یہ سب [illegible] سب گپھاؤں میں بیٹھے ہیں۔ یہ گپھائیں ہی دیکھنے لائق ہیں، لمبی، گہری، پانی سے بھری ہوئی۔ کچھ کی چھت بھی ٹپکتی ہے۔ بیچارے بڑی تکلیف میں ہیں۔ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں گئی۔ کوئی ان کی ٹپکتی چھت کی مرمت بھی نہیں کرواتا۔ میری آنکھیں بھر [illegible] کہ اس کے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکا۔ دیکھنے لائق ایک چیز ہے 'رجت پرپات'، اونچے کھڑے پہاڑ سے جھرتا ہوا کافی بڑا جھرنا۔ بھویہ، دِویہ (عظیم، فوق الفطرت) اپنے [illegible] میں اس سے بڑا جھرنا میں نے نہیں دیکھا۔ ویسے اس سے بڑا جھرنا میسور راجیہ میں "جوگ کے جھرنے" ہیں۔ لیکن میں نے جب انھیں دیکھا ہی نہیں تو ان کے بارے میں کیا کہوں؟ اسے ہی دیکھنے میں ٹانگیں ٹوٹی ہیں (محاورے میں، سچ مچ نہیں)۔

ایک اور جگہ ہے "دھوپ گڑھ" یہاں کی سب سے اونچی پہاڑ کی چوٹی۔ [illegible] وہاں سوریہ است (غروب آفتاب) اور سوریہ اُدے (طلوع آفتاب) دیکھنے جاتے ہیں۔ ہم لوگ سوریہ است سے ایک گھنٹہ پہلے ہی چلے آئے۔ کیوں کہ سوریہ است کے [illegible] ہونے کی کوئی سمبھاونا (امکان) نہ تھی۔ سورج بھگوان اچھے بھلے دکھ رہے تھے، لیکن ان

کے اردگرد بادل بھی تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ نیچے پہاڑوں کی شرنکھلاؤں (سسلوں) پر اچھا خاصا کہرا تھا۔ اس لیے ہم انھیں اسی طرح ہنستے مسکراتے، اتراتے ہی چھوڑ آئے۔ وے (وہ) شرم میں ڈوبیں، یہ دیکھنے کا جی نہ ہوا۔ گو یہ نظارہ دیکھنے کے لیے چھوکرے چھوکریوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی، جس میں بہتوں کے پاس کیمرے بھی تھے۔ لوٹ آنے کا ایک کارن یہ بھی تھا کہ ہم لوگوں میں سے کسی سیلانی کے پاس کیمرہ نہ تھا۔

اب کمرے میں لوٹ کر دیکھتا ہوں تو میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پتھر ہے۔ بہت خوبصورت۔ آم کی پھانک جیسا۔ تمھیں پسند آئے گا۔ یہ پتھر اسی 'رجت پربات' کے راستے سے اٹھا لایا:

کچھ یادگارِ کوے ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

سو یہ یادگار پتھر اٹھا لایا۔ لیکن فکر نہ کرو۔ یہ مجھ پر پڑا نہ تھا — پڑا ملا تھا راہ میں۔ جانے کس مجنوں پر پڑا ہوگا۔ یہ سوچ رہا ہوں اور اپنی بکواس یہیں ختم کرتا ہوں۔

بہت بہت پیار کے ساتھ

تمھارا ڈڈو۔ڈڈو

چچی

وہ جگت چچی تو نہیں تھیں لیکن محلے کے جن دو چار گھروں میں وہ چچی کہلاتی تھیں ان میں ایک گھر ہمارا بھی تھا۔ چچی کا نام فصیح اردو میں تو محمد النسا تھا لیکن خود اپنی زبان میں وہ اپنا نام ٹھہراؤ کے ساتھ ممدنساں اور روانی میں ممن نساں بتاتی تھیں۔ پڑھنے کے نام پر انھیں سوائے نماز کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ ایسی صورت میں ہاتھ میں قلم پکڑنے کا بھی کیا سوال پیدا ہوتا ہے، ہاں سینے پرونے میں انھیں وہ کمال حاصل تھا کہ اپنی سوئی کی نوک سے وہ کپڑے پر خطِ گلزار کے وہ نمونے پیش کر دیا کرتی تھیں جو بڑے بڑے خطاط اور خوش نویس قلم کے قط سے نہیں کر سکتے۔ چچی نے لگ بھگ اسی برس کی عمر پائی۔ زندگی کی آدھی صدی انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی دلی میں گزاری اور آدھی سے کچھ کم سینتالیس کے بعد کی دلی میں۔ چچی ان لوگوں میں تھیں جو اپنے زمانے کے علاوہ کسی اور زمانے میں نہ تو جینا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی جی سکتے ہیں۔ اس لیے چچی نے بھی سینتالیس کے بعد کے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال پرانی دلی کے اُن ہی محلوں میں گزار دیے جہاں وقت بالکل اُسی طرح ٹھہرا ہوا ہے جس طرح سیلاب کے گزر جانے

کے بعد سیلاب کا کچھ پانی آس پاس کے گڑھوں میں ٹھہرا رہ جاتا ہے۔ سینتالیس سے پہلے جب دلّی کی عورتیں تانگوں میں بیٹھ کر اور ان کے گرد موٹے موٹے پردے لپیٹ کر کوٹلے، نظام الدین، ہمایوں کے مقبرے، منصور کے مدرسے اور قطب صاحب کی سیر کو جاتی تھیں اور اولیا مسجد کے جھروکوں سے شمسی تالاب کا وہ نظارہ دیکھتی تھیں جہاں تالاب کے بیچوں بیچ مٹکوں پر بیٹھا کوئی آدمی سنگھاڑوں کی بیل سے سنگھاڑے توڑ توڑ کر جمع کر رہا ہوتا تھا تو چچی بھی اُن عورتوں میں ہوتی تھیں۔ لیکن سینتالیس کے بعد تو چچی بس ایک ہی بار فصیل کے باہر آئیں اور وہ بھی تب جب ہم انھیں دلّی دروازے کے باہر پہنچانے گئے تھے۔

معصوم قسم کی مذہبیت، پرانے رسم و رواج، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے، بدعتیں اور توہمات، چھلاوے پریوں اور جنات کے قصے، یہی وہ فضا تھی جس میں چچی پیدا ہوئیں اور زندگی بھر وہ اسی فضا میں سانس لیتی رہیں۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، چچی کو رانڈ ہی دیکھا۔ لیکن انھوں نے اپنا رنڈاپا جس کرّوفر سے گزارا، اسے دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ اگر کہیں ان کی جگہ ان کے میاں رنڈوے ہوگئے ہوتے تو شاید ایسی نہ گزار پاتے جیسی چچی گزار گئیں۔ چچی کے میاں اُن کی جان پہ چار لڑکیوں کو چھوڑ کر سینتالیس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جب تک اللہ بخشے وہ زندہ رہے، چچی کو خوب عیش کرایا۔ کچہری میں منشی تھے، اس لیے اس چھوٹی سی نوکری میں بھی پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ چچی کہا کرتی تھیں، 'بوا کوئی کیا کسی کے نخرے اٹھائے گا جو ہمارے میاں نخرے اٹھا گئے'۔ لیکن چچی کا جو طمطراق ہم نے دیکھا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نخرے چچی کے میاں نے شاید اتنے نہیں اٹھائے جتنے خود چچی نے ان سے اٹھوائے ہوں گے۔ پٹاری کے خرچے کے علاوہ اچھے سے اچھا

کھانے اور بڑھیا سے بڑھیا پہننے کا شوق بھی چچی نے میاں کے جیتے جی، جی کھول کر پورا کیا۔ کچہری کی آمدنی برسات کے پانی کی طرح جیسے گھر میں چھم چھم برستی تھی، ویسے ہی جھر جھر بہہ بھی جاتی تھی۔ اس لیے جب اچانک چچی کے میاں کا انتقال ہوا تو گھر میں چار معصوم بچیوں کے علاوہ باقی اللہ کا نام تھا۔ چچی کے پاس نہ تعلیم تھی اور نہ روپیا پیسا لیکن مفلس اور ان پڑھ لوگ جس عقیدے کے سہارے کڑی سے کڑی جھیل جاتے ہیں، وہ ان کے پاس بھی تھا یعنی یہ کہ جو لکھا ہے وہ پورا ہونا ہے۔ چچی شاید لوحِ محفوظ کی حقیقت سے تو واقف نہیں تھیں لیکن یہ فقرہ البتہ ان کی گفتگو میں تکیہ کلام کا سا درجہ رکھتا تھا کہ 'بوا لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا'، چچی نے بھی لکھے کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے لکھے کے آگے سر جھکا کر ہی اپنی ساری زندگی گزاری۔

چچی کو سینے پرونے میں فن کارانہ مہارت حاصل تھی۔ جب تک سہاگن رہیں طرح طرح کے جوڑے خود اپنے ہاتھ سے ٹانک کر پہنتی تھیں۔ اب یہی مہارت ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ ہاتھ کی ٹرپائی کے مقابلے میں اس 'موئی سنگر مشین' کی حیثیت چچی کے نزدیک وہی تھی جو اکبر بادشاہ کے نزدیک خطاطی کے مقابلے میں چھاپے خانے کی تھی۔ چچی اگرچہ انسان کے چاند پر پہنچنے کے بھی دس برس بعد اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن سلائی مشین کے ہینڈل کو ان کا ہاتھ مرتے دم تک چھو کر نہیں گزرا۔ وہ سلائی کا باریک سے باریک کام بڑی مہارت سے کرتی تھیں۔ ان کے کام میں لاگت برائے نام اور محنت اور کاریگری پوری ہوتی تھی۔ کپڑے کی رنگ برنگی کترنوں کو جمع کر کے، جو ادھر ادھر سے مفت مل جاتی تھیں، وہ سلائی کے کرتوں، ساڑیوں اور دوپٹوں پر کیکری کٹاؤ کا بہترین کام بنا دیا کرتی تھیں۔ چوں کہ اس کام کے کرنے والے بہت کم رہ گئے تھے اس لیے چچی کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔ تاہم اس کام سے ان کا بمشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ اپنے کام کی اجرت گاہک کی حیثیت کو دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی حیثیت کو دیکھ کر طلب کرتی تھیں۔ چچی نے اسی قلیل آمدنی میں اپنی چار لڑکیوں کی شادیاں کر ڈالیں اور دنیاداری کے معاملات کو بھی سلیقے کے ساتھ پورا کیا۔

چچی میں خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہتی تھیں۔ اسی لیے پرانی بڑی بوڑھیوں کی طرح انھیں ہر ایک کی سُن گُن لینے کی عادت تھی۔ آپ کوئی بات چچی کو بتانا چاہیں یا نہ چاہیں لیکن اُن سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی تھی۔ ہمارے محلے میں جوالا نام کی ایک بوڑھی دائی آیا کرتی ہیں، محلے کی ساری بڑی بوڑھیوں کے جاپے انھی کے ہاتھ سے ہوئے ہیں۔ جوالا سال میں تین بار یعنی شب برات، عید اور بکرید کو اپنے لگے بندھے گھروں سے عیدی لینے آتی ہیں اور اسی بہانے کن انکھیوں سے نئی نویلیوں کی چال ڈھال بھی دیکھ جاتی ہیں۔ پہلے تو وقت پڑنے پر لوگ خود جوالا کے گھر دوڑے جاتے تھے لیکن جب سے ہسپتالوں اور ڈاکٹرنیوں کا چکر چلا ہے، دائیوں کا کاروبار خاصا مندا ہوگیا ہے۔ جوالا کے ساتھ بھی اکثر یہ چوٹ ہوئی ہے کہ جب وہ بکرید کی گئی گئی شب برات کو کسی گھر میں لوٹی ہیں تو انھیں کوئی ننھا منا وہاں ہمکتا ہوا ملا ہے۔ اس معاملے میں چچی کا تجربہ جوالا سے کہیں زیادہ تھا اس لیے کہ جن گھروں میں ان کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا، وہاں تو چچی سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہتی تھی کہ دلہن کا جی پہلی دفعہ تیرہ تیزی کے مہینے میں متلایا یا بارہ وفات کے۔ چناں چہ جوالا بھی جب اپنے دورے پر نکلتیں تو چچی کے ساتھ خاصی کھُسر پھُسر کرکے جاتی تھیں۔ محلے کی کوئی عورت جب چچی سے یہ پوچھتی کہ فلاں کی دلہن کو کوتھا مہینہ ہے تو چچی انگلیوں کی پوروں پر رجب، شب برات، رمضان، عید، خالی وغیرہ کا حساب لگا کر فوراً بتا دیتی تھیں، تیسرا ہے، چوتھا ہے یا پانچواں۔ پیٹ والیوں کے پیٹ کا حال چچی، دائی سے بھی پہلے

جان لیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی گھر میں ولادت ہونے والی ہے اور دائی کو آنے میں دیر لگ رہی ہے تو ایسے میں چچی کی موجودگی سے بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ چچی نے کسی کا جاپا کرایا ہو یا نہ کرایا ہو، لیکن جاپے کے دنوں میں چچی کا پاس رہنا بڑا ضروری تھا۔ بڑی بوڑھیوں والے علاج اور نسخے تو چچی کے پاس بے شمار تھے۔ ذرا کسی کے بچے کی طبیعت بگڑی اور چچی حاضر۔ فوراً بقائی کی گھٹی منگا بچے کو پلا دی۔ ان کا خیال تھا کہ بقائی کی گھٹی بچوں کی ہر بیماری کا علاج ہے۔ آس پڑوس میں اگر ناوقت کسی کی طبیعت خراب ہوجائے تو فوراً چچی کو بلایا جاتا تھا۔ وہ مرض کی تشخیص اور اس کا علاج دونوں کر دیا کرتی تھیں۔ بعض موقعوں پر خود برقع اٹھا کر حکیم ڈاکٹر کے ہاں سے دوا بھی لا دیا کرتی تھیں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ڈاکٹر کی ایک نئی دکان کھلی تھی، چچی نے اسے آزمایا تو ڈاکٹر ٹھیک نکلا۔ لیکن نیا نیا ڈاکٹر تھا، اس لیے زیادہ مریض اس کے پاس نہیں جاتے تھے۔ چچی کا اس ڈاکٹر کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ 'بوا ہے تو ٹٹ پونجیا مگر دوا اچھی دیتا ہے'۔

چچی جس مکان میں رہتی تھیں اس میں کنبے کے کئی گھر آباد تھے۔ دن بدن اس گھر کی آبادی بڑھتی جارہی تھی جس سے چچی کے لیے جگہ تنگ ہوتی جارہی تھی۔ جتنا چچی کی بیٹیاں ان کو مانتی تھیں اتنا نواسیاں نواسے نہیں مانتے تھے اور جب نواسیوں کے بھی بچے ہونے لگے تو ان کے لیے تو چچی کی حیثیت ایک آثار قدیمہ کی سی تھی۔ ایک طرف عمر کے ساتھ مزاج بے ٹھکانے ہوتا جارہا تھا اور دوسری طرف نئی پود نے چچی کے ساتھ ہر وقت چھیڑ خانی مچا رکھی تھی، جس سے چچی اکثر ان سے ناراض ہوجایا کرتی تھیں۔ ایسے میں آکر ہمارے گھر میں کہا کرتی تھیں، 'بوا آج کل میں گھر میں سب سے ناراض ہوں'، پھر دوسرے ہی سانس میں یہ بھی بتاتی تھیں کہ 'کسو کو پتا تھوڑی ہے کہ میں ناراض ہوں'۔

چچی کبھی کبھی بڑے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی صاحبہ کا ذکر کر رہی تھیں جو اپنے گھر میں اپنے میاں کو خلوتوں کا زیادہ موقع نہیں دیتی تھیں، چچی کا کہنا تھا، 'بوا تم جانو مرد ذات، خالی بٹھا کے تو کھلانے سے رہا'۔ ایسے ہی ایک بار مہنگائی کا رونا روتے ہوئے بولیں، 'آج کل تو روٹی کھانا بھی چاندی چبانا ہے'۔ چچی کو اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ آج کل کے لوگوں نے فیشن میں آکر 'چا' میں نمک ڈالنا چھوڑ دیا ہے اور پتی کو بھی اوٹانے کے بجائے اب کچے رنگ کی 'چا' پینے لگے ہیں۔ وہ کہتی تھیں، 'اسی لیے تو اب چا پینے کا کوئی فیدہ نہیں ہوتا، نہ سردی دور ہو نہ نزلہ'۔

ہسپتال سے، جسے وہ اسپتال کہتی تھیں، چچی بڑا ڈرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کو ہسپتال بھیجنے کا مطلب اسے جیتے جی قبرستان بھیجنا ہے۔ چچی کے ایک داماد کسی موذی مرض کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو مہینے بعد اچھے ہو کر گھر لوٹے لیکن چچی کا تاثر یہ تھا کہ 'بوا جب اسپتال میں بھرتی ہوا تھا تو خاصا ہٹا کٹا تھا، مُردوں نے ادھ مرا کر کے نکالا ہے، نگوڑے کے بدن سے سارا خون کھینچ لیا'۔

سائنس کی نئی نئی ایجادات نے جیسے نظامِ فطرت کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے، ویسے ہی چچی کے اعصاب کو بھی متاثر کر دیا ہے۔ بس اور موٹر کی گھوں گھوں سے چچی کو چکر آتے تھے اس لیے وہ ان سواریوں میں کبھی نہیں بیٹھتی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ریل میں بھی کبھی بیٹھی تھیں یا نہیں۔ ایک بار کسی بہانے گھر والے انھیں بائیسکوپ لے گئے۔ اُس بند اور تاریک منڈوے میں ان کا ایسا دم گھٹا کہ انھوں نے منڈوے کی بتیاں بجھتے ہی چلو چلو مچادی اور ان کے ساتھ سب کو ویسے ہی واپس آنا پڑا۔ 'ریڈوے' کی دھائیں دھائیں سے تو ان کا ویسے ہی سر چکراتا تھا اب یہ 'نئی آفت موئی ٹیلی وِجن' شروع ہوئی تھی۔ اِدھر شام کو گھر میں ٹیلی وژن کھلا اور اُدھر چچی نے اپنا برقع اٹھا کسی

ایسے گھر کا رخ کیا جہاں ٹیلی وژن نہیں تھا۔

چچی کی والدہ کا انتقال خود چچی کے انتقال سے کوئی سات یا آٹھ برس پہلے ہی ہوا تھا۔ ان کی اماں نے کوئی سو سے اوپر عمر پائی تھی۔ جیسا کہ اتنی عمر کے لوگوں کا حال ہوتا ہے، بے چاری بڑی بی بالکل حواس باختہ اور معذور بس کھٹولے پر ہی پڑے پڑے دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت پاتی تھیں۔ اس حالت میں 'غدر' کے زمانے کی اس بڑھیا بے چاری کا گو موت کون کرتا، بس چچی ہی جیسے تیسے کرتی تھیں۔ چچی دل سے چاہتی تھیں کہ اللہ ان کی اماں کا پردہ ڈھک لے مگر چچی کے نواسے نواسیوں کا خیال تھا کہ بڑی بی تو قیامت کے بوریے سمیٹ کر جائیں گی۔ انھوں نے تو قیامت کے بوریے نہیں سمیٹے لیکن جب تک وہ زندہ رہیں، ان کی صفائی ستھرائی کے رستے چچی ضرور جنت کی جھاڑو دیتی رہیں۔ جب کبھی ہم چچی سے ان کی اماں کی خیر صلا خیر عافیت پوچھتے تو وہ ان کی حواس باختگی کا ذکر اپنی بھولی بھالی زبان میں یوں کرتیں: 'وِن کے خیالات خراب ہوگئے ہیں، بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں'۔

چچی نے بیوہ اور بے سہارا ہونے کے بعد اپنے تمام تر دقیانوسی پن کے باوجود حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا تھا۔ وہ سیدانی تھیں اور اس زمانے کی سیدانی جب بیاہ شادی کے معاملوں میں لڑکی دیتے ہوئے اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب چچی نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں کیں تو ان کے سامنے ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ رانڈ ماں کی جوان بچیاں جتنے جلدی اپنے گھر کی ہوجائیں اچھا ہے۔ انھوں نے سیدزادوں کے انتظار میں اپنی لڑکیوں کو چھاتی پہ نہیں بٹھائے رکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چاروں دامادوں میں سے کوئی سیدزادہ ہے یا نہیں۔

محلہ قبرستان کے بیچوں بیچ ایک درگاہ ہے، درگاہ حضرت شمس العارفین۔ حضرت

شمس العارفین کو محلّے والے دادا پیر کہتے ہیں اور انھی کے دم کی برکت سے خود کو ہر بلا سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ محلّے کی بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں ہر جمعرات کو دادا پیر کے مزار پر چراغ اور اگربتیاں جلاتی ہیں اور کھیلوں اور الائچی دانوں کی نیاز دیتی ہیں۔ اسی محلّے قبرستان میں ایک اور بزرگ کی بڑی سنگین قسم کی قبر لبِ سڑک بنی ہوئی ہے اور اس قبر کی پشت پر سے میونسپلٹی کی نالی بہتی ہے۔ اس قبر کی پائنتیوں میں بھی ایک چھوٹی سی قبر ایک بچے کی بھی تھی جو سڑک کے پختہ بن جانے سے اب معدوم ہوگئی ہے۔ چچی ان دونوں قبروں کے بارے میں بڑا دل چسپ قصہ سنایا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ نالی کے پاس والی قبر پہلے دادا پیر کے 'احاطے' میں تھی، یہ اپنے وقت کے بڑے جلالی بزرگ تھے۔ ایک دفعہ کوئی عورت درگاہ میں فاتحہ پڑھنے گئی، اس کے بچے نے قبر کے پاس پیشاب کردیا۔ بس پھر کیا تھا، انھیں جلال آگیا اور انھوں نے بچے کو ایسی پٹخنی دی کہ بچہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ عورت رو رو کر دادا پیر کے مزار کی پائنتی اپنا سر دھننے لگی۔ دادا پیر ان کے اس بے جا جلال پر بہت ناراض ہوئے اور ان کے مزار کو اپنے 'احاطے' سے اٹھا کر یہاں نالی کے پاس پھنکوادیا۔ 'تو بوا آج تک نالی کے پاس پڑے ہیں'۔ چچی سے ہماری یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ چچی یہ قبر تو یہاں میونسپلٹی اور اس کی نالیوں کے وجود سے بہت پہلے کی ہے۔

چچی کو وہ مرد بڑے عجیب لگتے تھے جو گھر کے کام کاج میں حصہ لیتے ہیں۔ مجھے باورچی خانے میں گھسنے کا کچھ زیادہ ہی مرض ہے۔ اگر ایسے موقعے پر کبھی چچی آدھمکتیں تو فوراً میری بیوی سے کہتیں، 'اچھا بوا تو آج یہ پکا رہے ہیں' اس بات کا سلیس اُردو میں یہ مطلب ہوتا تھا 'ڈوب مرو خصم سے کھانا پکوا رہی ہو'۔ لہٰذا مجھے بیوی کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ اگر میں باورچی خانے میں ہوں اور چچی آتی دکھائی دے جائیں تو فوراً ہنڈیا

چھوڑ چھاڑ جا کر اپنے لکھنے پڑھنے میں لگ جاؤں۔ مجھے گھر میں کام کرتا دیکھ کر چچی کہتی تھیں، 'بوا تمہارے میاں تو خاصا ہاتھ بٹا دیتے ہیں، ہمارے دامادوں میں سے تو کوئی ہل کے پانی بھی نہیں پیتا'۔

چچی ہمارے گھر کتنے ہی مختصر دورے پر کیوں نہ آئیں لیکن چاق و چوبند پریس رپورٹر کی طرح وہ جلدی جلدی اپنی تمام تفتیش مکمل کرلیا کرتی تھیں۔ ایک بار میں گھر پر اکیلا تھا۔ یونیورسٹی کی کچھ خواتین کسی سلسلے میں میرے گھر پر آئیں، کچھ ہی دیر میں پیچھے پیچھے چچی بھی آگئیں۔ انھیں ذرا جلدی تھی، اس لیے بس کھڑے کھڑے کو آئی تھیں۔ چچی نے آتے ہی ان اپٹوڈیٹ خواتین کو دیکھا، پھر میری طرف دیکھا، پھر ان سے مخاطب ہوئیں اور بولیں، 'اچھا تو بوا تم دلہن سے ملنے آئی ہوگی'۔ میں نے کہا، چچی نہیں یہ تو مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ چچی یہ سنتے ہی برقع ایک طرف رکھ، پھسکڑا مار کے بیٹھ گئیں اور لگیں ان خواتین سے طرح طرح کی باتیں کرنے۔ کچھ ہی دیر میں میری بیوی بھی آگئیں۔ اب ذرا چچی کی جان میں جان آئی اور انھیں یہ بھی یاد آیا کہ 'اے ہے میں تو کھڑے کھڑے کو آئی تھی'۔ یہ بات چچی کی سمجھ میں بہت دن تک نہیں آئی کہ عورتیں بجائے میری بیوی کے مجھ سے ملنے کیوں آئی تھیں اور اگر آئی بھی تھیں تو میری بیوی نے اس کا فضیحتا کیوں نہیں کیا۔

آخری دنوں میں جب آنکھوں اور ہاتھ پیروں سے مجبور ہوگئی تھیں اور ان سے کام بھی زیادہ نہیں ہوتا تھا تو ان کا وقت زیادہ تر اپنے قدردانوں کے گھروں میں گزرتا تھا۔ وہ سلوک کی توقع میں وہاں جاتی تھیں مگر اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایسے موقعے پر وہ بڑی ہانپتی کانپتی دروازے میں داخل ہوتی تھیں، لگتا تھا اب گریں۔ لوگ انھیں سہارا دے کر بٹھاتے۔ تھوڑی دیر میں ان کے حواس بجا ہونے شروع ہوتے اور پھر

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھلی چنگی ہوجاتیں اور پھر آگے کے معاملات یوں چلتے:

'چچی چا پئیں گی؟'

'بوا تم پی رہی ہو تو ذری سی مجھے بھی بنادو۔'

'چچی کھانا کھائیں گی؟'

'لاؤ کہتی ہو تو کھالیتی ہوں، کیا پکایا ہے؟'

'اروی کا سالن۔'

'دے دو ذرا سا — نیبو اور گرم مسالہ بھی ہے؟'

اب چچی کے سامنے کشتی میں کھانا لگا ہوا ہے، چچی کھاتی جارہی ہیں اور کھانے پر بے لاگ تبصرہ کرتی جارہی ہیں۔

'اے بوا چپاتی کے کنارے ذرا سے کچے رہ گئے ... کنارے چھوڑنا رزق کی بے ادبی ہے ... دیکھنا سالن میں نمک پھیکا رہ گیا۔ اب اگر آپ انھیں پسا ہوا نمک پیش کریں تو کہیں گی، 'اے بوا کچے وے نمک کا اور مزا ہوتا ہے، کچا نمک ڈالنے میں وہ بات تھوڑی آتی ہے۔ چچی کو پانی پلانا بھی اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہوتا تھا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی کہتی تھیں، 'اے کیا صراحی تازی بھری ہے؟ بالکل گرم پانی ہے۔'

عمر کے ساتھ ساتھ چچی کا ہاضمہ بھی جواب دے چکا تھا لیکن زبان کا چٹخارا پھیکے سیٹھے کھانوں کو قبول نہیں کرتا تھا اس لیے آئے دن انھیں بقائی کی دو نمبر خوراک پینی پڑتی تھی۔ بقائی کی دو نمبر خوراک کا بھی اپنا مزا ہے۔ پیٹ کی تکلیف کی اتنی مزے دار دوا ہمیں سب سے پہلے چچی نے ہی بتائی تھی۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں سے پیٹ پکڑے پکڑے ہمارے گھر آئیں۔ میری بیوی نے کہا، 'چچی پھر کچھ الٹا سیدھا کھا لیا کیا؟' کہنے لگیں، 'بوا تم جانو بندہ بشر ہے سب کو کھاتا دیکھ کر ذری سی لال روٹی کا ٹکڑا اور دو نوالے

چانولوں کے میں نے بھی کھا لیے، ایسا کون سا غضب ہوگیا۔ تم جانو سدا سے اچھا کھایا۔' ان کی حالت یہ تھی کہ رکھا پکا کھایا نہیں جاتا تھا اور قورمہ بریانی پچتا نہیں تھا۔

آخری دنوں میں جب چچی کی آنکھیں حد سے زیادہ جواب دے گئیں اور ان کی نظروں سے سوائے دھند کے دنیا کی ہر چیز اوجھل ہوگئی تو انھوں نے برقعے کو بھی کھونٹی پہ ٹانگ دیا۔ شاید وہ یہ سمجھنے لگی تھیں کہ جس طرح ان کی آنکھوں سے دنیا اوجھل ہوگئی تھی، اسی طرح دنیا کی آنکھوں سے وہ خود بھی اوجھل ہوگئی ہیں۔ ویسے وہ کہا کرتی تھیں، 'بوا پردہ کیا بس ذری سی آنکھ کی شرم ہے، اب جب آنکھیں ہی پٹم ہوگئیں تو پردہ کاہے کا۔'

چچی اپنی ضعیف العمری کے ساتھ ساتھ موت سے بہت ڈرنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی قبر کی کال کوٹھری کے تصور سے بھی۔ سب ان کو دلاسا دیتے رہتے تھے کہ چچی ابھی آپ مرنے والی نہیں ہیں۔ آپ کی اماں کو مرے کے برس ہوئے ہیں جو آپ مرنے کی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں سے بھولی بھالی چچی کے دل سے شاید کچھ دیر کے لیے موت کا ڈر دور ہوجاتا۔ پھر وہ کہنے لگتی تھیں، 'بوا دعا کرو آنکھوں میں ذری سی روشنی آجائے تو پھر کچھ ہاتھ پیر ہلانے شروع کروں۔ یہ موئی تج تج کی محتاجی سے تو میرا جی بولا گیا۔' اور یہی کہتے کہتے ایک دن چچی چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے عزیزوں نے ان کے ہاتھوں میں پڑی سونے کی دو چوڑیوں اور کانوں کی بالیوں سے ان کا کفن دفن کیا، اور دلّی دروازے کے باہر سے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر آئے جہاں بہت سی گمنام اور جلد ہی بے نشاں ہوجانے والی قبروں میں ایک قبر ان کی بھی ہے۔

❁❁❁

استاد رسا دہلوی

ہماری اسی زمین پر انسانی بستیوں سے بہت دور ایسے مقامات بھی ہیں جہاں اب تک کوئی بھولا بسرا شخص بھی نہیں پہنچ پایا ہے۔ ان نامعلوم مقامات میں بہت سی خوبصورت وادیاں، آبشار، جھیلیں، چشمے، پھل پھول اور پودے ایسے ہوں گے جو فطرت کی صناعی کا بہترین نمونہ ہوں گے۔ یہ حسین اور خوشنما منظر قرنوں کی دھوپ چھاؤں میں مٹتے اور بنتے رہتے ہوں گے۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی منظر بن بن کر مٹ چکے ہوں گے لیکن ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم، اس لیے کہ یہ منظر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے باوجود اس بات سے محروم رہے کہ کوئی ان کی تاریخ مرتب کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے اس کے اوراق میں محفوظ کر دیتا۔ ہم لوگ جس چیز کو دلّی کی تہذیب کہتے ہیں اور جس پر بجا طور پہ فخر بھی کرتے ہیں، اس کی مثال بھی اُن نامعلوم حسین منظروں کی سی ہے جو بنتے اور مٹتے جا رہے ہیں اور بس۔ جب یہ منظر نہیں رہتے تو ہم یہ تک بھول جاتے ہیں کہ یہ منظر کبھی تھے بھی یا نہیں۔ استاد رسا دہلوی بھی ایسا ہی ایک منظر تھے جنھیں آج محض چند لوگ جانتے ہیں اور کل وہ بھی نہیں ہوں گے۔ جو لوگ استاد رسا کے بارے میں کچھ

جانتے بھی ہیں، ان کی مثال بھی کسی جاں فزا منظر پر سے گزرنے والی اس ہوا کی سی ہے جو منظر کی خوشبو میں تو ضرور بسی ہوئی ہوتی ہے لیکن منظر کے عکس و آثار کا پتا نہیں دیتی۔ استاد رسا کے بارے میں معلومات بھی اس خوشبو جیسی ہی ہیں۔ چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، سانولا رنگ، سر پر پوری طرح منڈھی ہوئی ململ کی ٹوپی، پیشانی پر عین وسط میں ٹوپی کے کنارے کو چھوتا ہوا دہکی ہوئی رات جیسا نماز کا گٹا، ستواں ناک، ہر وقت پان کھاتے رہنے کی وجہ سے لب اور دہن گلنار، سامنے کے دانت پان کی زیادتی سے قدرے سیاہی مائل، باشرع مسلمانوں کی طرح ترشی ہوئی لبیں، کھچڑی ڈاڑھی مگر ایسی کھچڑی جس میں چاول کی مقدار کچھ زیادہ ہو، ڈاڑھی کے بیچوں بیچ پان کی پیک کی سرخ لکیر، چہرہ لمبوترا جو سوا مُٹھی ڈاڑھی سے کچھ اور لمبوترا دکھائی دیتا تھا، کالی واسکٹ اس کے نیچے معمولی سے سوتی کپڑے کی قمیض، گردن میں لٹکا ہوا بڑا سا رومال یا چادر جس کے دونوں سرے سامنے کی جانب دائیں اور بائیں طرف لٹکے ہوئے، ذرا چوڑی موری کا گاڑھے یا گزی کا اُٹنگا پاجامہ، ایک بغل میں کاغذوں کا پلندہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی، یہ تھے، استاد رسا دہلوی۔

استاد رسا کے والد کون تھے اور کیا کرتے تھے، یہ بات آج کوئی نہیں جانتا۔ ان کے والد کا نام کیا تھا، یہ بھی کسی کو نہیں معلوم لیکن یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ استاد رسا کے والد سید تھے اور والدہ بھی سیدانی تھیں۔ یہ بات ہم وثوق سے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ خود اُستاد رسا کی زبانی ان کی زندگی کے جو چند حقائق ہم تک پہنچے ہیں ان میں ایک ان کا سید ہونا بھی تھا۔ وہ اپنے سید ہونے پر بڑا فخر کرتے تھے اور گفتگو کے دوران ان کے منہ سے نکلنے والا ہر پانچواں فقرہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان کے سید ہونے سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے عقیدت مند تھے۔ اس لیے ایک طرف

ان کے زندگی گزارنے کے انداز میں اگر سیدوں کی سی آن بان تھی تو دوسری طرف ان کے مزاج میں ایک صوفیانہ استغنا بھی تھا۔ چناں چہ سید رفیق احمد رسؔا دہلوی کو بعض لوگ صوفی سید رفیق احمد رسؔا دہلوی بھی کہتے تھے۔

دلّی والوں میں دلّی اور اس کی ہر شے سے محبت تعصب اور دیوانگی کی حد تک پائی جاتی ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب دلّی ایک بار پھر اجڑی تو بچے کھچے دلّی والوں میں دہلویت کا یہ جذبہ اور شدت اختیار کرگیا۔ اُستاد رسؔا ان لوگوں میں تھے جن کے نزدیک دلّی صرف شاہجہاں آباد کا نام تھا۔ شاہجہاں آباد آج کی ٹاؤن پلاننگ کی اصطلاح میں walled city کہلاتا ہے۔ اُستاد رسؔا صرف اندرون فصیل کے رہنے والوں کو دلّی والا مانتے تھے اور انھی کی زبان مستند سمجھتے تھے۔ باڑہ ہندو راؤ، صدر بازار، قرول باغ، پہاڑ گنج اور شاہدرہ کو وہ foreign country کہا کرتے تھے۔ شعروسخن کے میدان میں ۱۹۴۷ سے پہلے دلّی میں داغؔ اسکول کا طوطی بولتا تھا۔ اُستاد رسؔا جانشینِ داغؔ، سید وحید الدین بیخوؔد دہلوی کے شاگرد تھے۔ سائلؔ دہلوی اور علامہ زارؔ دہلوی کے مقابلے میں اُستاد رسؔا نے شاید بیخوؔد دہلوی کی شاگردی اسی لیے قبول کی کہ بیخوؔد صاحب اُستاد رسؔا کی طرح سید تھے۔ ویسے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیخوؔد صاحب کے ساتھ اُستاد رسؔا کی دور پرے کی رشتے داری بھی تھی۔

اُستاد رسؔا کا مکان دلّی میں حوض سوئی والان میں تھا لیکن وہ سب سے کم محلہ سوئی والان میں ہی دکھائی دیتے تھے۔ رات گئے گھر لوٹنا اور صبح سویرے پھر نکل کھڑے ہونا۔ اُستاد نے لڑکپن میں اُردو، فارسی اور اس کے ساتھ کچھ دینیات اور کچھ طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ انہیں فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا اور وہ دلّی کے مغل کلب میں کھیلتے تھے۔ حاجی ہوٹل کے مالک حافظ ظہورالدین صاحب کے چھوٹے بھائی امین الدین ان

کے بچپن کے دوستوں اور فٹ بال کے ساتھیوں میں تھے۔ اُستاد نے اس زمانے میں فٹ بال کھیلی ہے جب کہ ہندوستانی ننگے پیر اور ان کے مقابلے میں گورے بوٹ پہن کر فٹ بال کھیلتے تھے۔ انھوں نے کچھ دن امپیریل تمباکو کمپنی میں اسٹور کیپر کی حیثیت سے کام کیا تھا لیکن مزاج میں ٹھہراؤ نہیں تھا اس لیے جلد ہی نوکری چھوڑ چھاڑ الگ ہوئے اور پھر بقیہ زندگی آزادہ روی کے ساتھ گزاری۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اُستاد رسؔا نے شادی نہیں کی اور کچھ کا کہنا ہے کہ انھوں نے شادی کی تھی لیکن جلد ہی ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور پھر انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ تمام زندگی اپنی والدہ اور دوسرے عزیزوں کی خدمت میں گزاردی۔ اُستاد رسؔا کی والدہ خود استاد کی وفات سے چار پانچ سال پہلے تک حیات رہیں۔ آخر میں استاد کی زندگی کا واحد مقصد والدہ کی خدمت کرنا تھا، یہاں تک کہ آخری دنوں میں جب وہ بے انتہا ضعیف ہوگئی تھیں تو استاد ان کی نجاست تک اٹھایا کرتے تھے۔ اس معاملے میں انھوں نے اپنی والدہ کی اتنی دعائیں لی ہیں کہ ان دعاؤں کا شمار صرف کراماً کاتبین کے پاس ہی ہوسکتا ہے۔ اُستاد کے ایک بھائی کا انتقال بھی بہت شروع میں ہوگیا تھا، بھائی کی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال بھی انھوں نے ہی کی۔ اُستاد رسؔا کی اپنی ضروریات انتہائی محدود تھیں اور ان کے وسائل اس سے بھی زیادہ محدود، لیکن ان کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ کبھی کسی کو مصیبت اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جو بھی ان سے بن پڑتا اس کے لیے کرتے تھے۔

۱۹۴۷ کے بعد جب ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں نے کاسموپولیٹن انداز اختیار کرنا شروع کیا تو دلّی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ دلّی میں روزگار کی تلاش کے سلسلے میں چاروں طرف سے یلغار شروع ہوگئی۔ شاہجہاں آباد کا علاقہ جسے پرانی دلّی بھی کہتے ہیں، ایک غریب پرور علاقہ تھا اس لیے اس علاقے میں آکر بسنے والے لوگ زیادہ

تر وہ تھے جو عام طور پر ناخواندہ تھے اور چھوٹے موٹے روزگار کی تلاش میں دلّی میں آکر بس رہے تھے اور اس کی بھیڑ میں اضافہ کر رہے تھے۔ چتلی قبر اور مٹیا محل کے بازار میں اب چلتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلنے لگا تھا۔ سائیکل رکشا کا اگلا پہیا کبھی آگے سے اور کبھی پیچھے سے ان راہگیروں کی ٹانگوں کے بیچ میں اٹکنا شروع ہوگیا جو ان بازاروں کو اب تک اپنے گھر کی انگنائی سمجھتے تھے۔ جامع مسجد کے آس پاس کے ہوٹلوں میں گھنٹوں فرصت سے بیٹھنے کا سلسلہ تو اب بھی جاری تھا لیکن بھانت بھانت کے گاہکوں کی یورش نے ہوٹلوں میں مستقل ڈیرہ جمائے رکھنے والوں کی صحبتوں کو مکدّر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ہوٹلوں کے مالکوں کے اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑنا شروع ہوا اور وہ سخن فہموں سے زیادہ گاہکوں کی پروا کرنے لگے اور جنھوں نے ایسا نہیں کیا، انھیں جن کی طرح اپنا ہوٹل بیچ باچ بھاگنا پڑگیا۔ اس صورت حال میں اُستاد رساؔ کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ انگریزوں نے جمنا کا پل بنوا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہی حالت رہی تو ایک دن جمنا کا پل تڑوانا پڑے گا اس لیے کہ جسے دیکھو لنگڑا لولا ٹیڑھا بانکا جمنا پار سے چلا آرہا ہے۔

اُستاد رساؔ کی چال اور مزاج دونوں میں بلا کا بانکپن تھا۔ وہ کڑی کمان کے تیر کی طرح چلتے تھے۔ وہ بلا کے شدت پسند تھے۔ ان کے ہاں دوستی اور دشمنی کے درمیان بیچ کا راستہ کوئی نہیں تھا۔ ان کے طرز زندگی پر ان کے اس اسلامی عقیدے کا پرتو تھا جہاں کفر اور ایمان کے درمیان کسی شرک، کسی بدعت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مخالفوں کا شجرۂ نسب انھیں زبانی یاد رہتا تھا چناں چہ ایک مرتبہ اُستاد رساؔ کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی اسکیم بن رہی تھی۔ کسی صاحب نے کہا، خلیق انجم صاحب یہ کام آپ کریں، لیکن خلیق انجم صاحب نے ہنستے ہوئے یہ کہہ کر معذرت چاہ لی کہ حضرات میرے شجرۂ نسب میں

پہلے ہی خرابی ہے، میں اسے الم نشرح نہیں کرانا چاہتا۔ آج سے لگ بھگ بیس برس پہلے جب اُستاد رساؔ پر ڈاکٹر خلیق انجم کا خاکہ رسالہ 'ساقی' میں چھپ کر منظر عام پر آیا تو یار لوگوں نے استاد کے کان بھرنے شروع کیے کہ استاد، خلیق انجم نے آپ کی شخصیت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ لیکن جیسے جیسے اس خاکے کی شہرت ہوتی گئی، استاد کی خوشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب تک خلیق انجم کے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ تھا، اس دن کے بعد سے تو وہ ان کے مرید ہوگئے۔ وہ جس سے محبت کرتے تھے پھر ٹوٹ کر ملتے تھے۔

اُستاد میں ریاکاری نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ اس مذہبی ریاکاری کے بھی سخت مخالف تھے جس کا ذکر فارسی اور اُردو کے شعرا نے شیخ اور زاہد کے حوالے سے کیا ہے۔ اُستاد رساؔ روزے نماز کے پابند تھے لیکن اس طرح کہ انھوں نے اپنی عبادت کو کبھی کسی پر مسلط نہیں کیا۔ وہ محبت، مروّت، خدمت اور دل جوئی ان تمام چیزوں کو بھی عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ چناں چہ عمر کے آخری دنوں میں بعض معذوریوں کے وجہ سے جب وہ روزہ نماز ترک کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے تو اس کی کمی وہ اپنی ان نیکیوں ہی سے پوری کرتے تھے۔ اُردو بازار میں رشید آرٹسٹ صاحب کی دوکان پر ان کی مستقل نشست رہا کرتی تھی۔ اس دوکان کی برسوں سے ایک روایت یہ بھی چلی آرہی ہے کہ رمضان کے دنوں میں چھ سات احباب یہاں ایک ساتھ روزہ کھولا کرتے ہیں، ان میں اُستاد رساؔ بھی شامل ہوتے تھے۔ آخری دنوں میں بیماری کے سبب جب اُستاد روزے رکھنے سے معذور ہوگئے تو انھوں نے یہ دستور بنا لیا کہ روزے سے کچھ پہلے رشید آرٹسٹ صاحب کی دوکان پر امرود، پپیتا یا کوئی اور پھل لے کر پہنچ جاتے۔ رشید آرٹسٹ نے ان سے کئی بار کہا کہ اُستاد آپ یہ کیا تکلف کرتے ہیں، خدا کے فضل سے یہاں سب انتظام رہتا ہے۔ لیکن اُستاد نہ مانے۔ آخر ایک دن جب اس بات پر بہت بحث ہوئی تو انھوں نے کہا، بھئی اگر

تیری چتون'۔ اُستاد نے بیچ میں ہی ٹوکا اور کہا، دیکھ کر پڑھو بیٹا۔ شاگرد نے کاغذ کو دیکھ بھال کے پھر مصرع شروع کیا اور پھر وہی 'اللہ رے تیری چتون'۔ اُستاد نے اور زیادہ پیار سے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے وہی بات کہی، بیٹا دیکھ کے پڑھو۔ شاگرد کچھ دیر کے لیے رکا، پہلے اس نے پورا شعر زیرِلب دہرایا اور پھر ایک بار وہی 'اللہ رے تیری چتون'۔ اب کے اُستاد رسا نے شاگرد کی کمر پر زور سے ایک دھپ جمایا اور ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا، چتون نہیں پڑھ سکتا۔ اُستاد رسا کے شاگردوں کو اکثر دوسرے لوگ لے اڑا کرتے تھے جس سے وہ برگشتہ ہوجاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُستاد جس رنگ کے شعر کہتے تھے وہ ان پر تو کھپ جاتے تھے لیکن ان کے شاگردوں کا کام ایسے شعروں سے نہیں چلتا تھا۔ مشاعروں کی منڈی میں جس طرح کے نئے مال کی مانگ تھی وہ اُستاد کے پاس نہیں تھا۔

اُستاد رسا پکے نیشنلسٹ تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی مسلم لیگیوں سے ان کی بڑی نوک جھونک ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبوں حالی کے باوجود ہندوستان کیا دلّی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے بھتیجا بھتیجی جنھیں انھوں نے پال پوس کر بڑا کیا تھا، پاکستان میں خوشحال زندگی بسر کررہے تھے۔ انھوں نے لاکھ چاہا کہ اُستاد اپنے آخری دن پاکستان آکر آرام سے گزار لیں لیکن دلّی کو خیرباد کہنا انھیں ایک آن پسند نہ تھا۔

اُستاد رسا دہلوی کو اپنے اُستادِ محترم بیخود دہلوی سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ چناں چہ ان کی زندگی کا ایک واحد مشغلہ بیخود دہلوی کی یاد میں ایک سالانہ مشاعرہ کرنا تھا۔ اس مشاعرے کے لیے انھوں نے ایک بیخود اکیڈمی قائم کی تھی جو ان کی ذات اور اس کاغذ کے پلندے تک محدود تھی، جو ہر وقت ان کی بغل میں رہتا تھا۔ اُستاد رسا نے یومِ بیخود کا مشاعرہ ابتدا میں بہت چھوٹے پیمانے پر کیا تھا لیکن اپنی لگاتار کوششوں سے انھوں نے اس مشاعرے کو عروج پر پہنچا دیا۔ وہ تن تنہا سال بھر اس مشاعرے کی تیاریوں میں

لگے رہتے تھے۔ مشاعرے سے تین چار مہینے پہلے اس کے پوسٹر آنے شروع ہوجاتے تھے، پھر جامع مسجد کے چوک پر جھنڈیاں لگتیں، رنگ برنگے قمقمے جلتے، کلام پڑھنے والے شعرا کے لیے انعام میں دینے کو میڈل اور کپ بھی ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ خالص عوامی مشاعرہ تھا اس لیے کہ اس کے لیے اُستاد بڑے آدمیوں کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ عام لوگوں سے گھر گھر جاکر دس دس پانچ پانچ روپے جمع کرتے اور اس سے یہ مشاعرہ بڑے شاندار طریقے سے منعقد ہوتا تھا۔ افسوس کہ بعض نوجوانوں کی بے جا شوخیوں نے اس مشاعرے کو رفتہ رفتہ ناکام کرکے ختم ہی کردیا اور اسی کا صدمہ خود اُستاد رسا کو بھی کھا گیا۔ سچ پوچھیے تو اس کے بعد سے دلّی میں عوامی مشاعروں کی روایت ہی ختم ہوگئی۔

اُستاد رسا شعرگوئی کے معاملے میں داغ اور بیخود کی روایات کے امین تھے۔ وہ پورے دروبست کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔ ان کے اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے کافی مشق کی ہے لیکن اس کے حساب سے ان کا دستیاب شدہ کلام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُستاد مشاعرے میں اکڑوں بیٹھ کر شعر پڑھتے تھے اور مصرعے کے ساتھ خود بھی گھٹنوں کے بل اُٹھتے جاتے تھے۔ شعر کے نقطۂ عروج پر پہنچتے پہنچتے وہ کافی جوش میں آجاتے تھے اور ٹانگوں کو ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر شعر سناتے تھے۔ داغ کی زبان اور محاورے کا چٹخارہ ان کے اشعار میں خوب ہوتا تھا۔ انھوں نے نہ اپنے کلام کو محفوظ رکھا اور نہ کہیں شائع کرایا۔ آج صرف ان کی ایک دو غزلیں اور چار چھ قطعات ہی ہمارے سامنے ہیں اور وہ بھی کہیں تحریری شکل میں نہیں ہیں بلکہ ان کے قدردانوں کو زبانی یاد ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کرتے چلیے:

کیوں ہوئے خانہ نشیں یہ کیا کیا تم نے غضب
گھر سے نکلو گرمیِ بازار آدھی رہ گئی

طوؔر پہ موسیٰ نے دیکھی ایک جھلک تو کیا ہوا
آدھی نکلی حسرتِ دیدار آدھی رہ گئی

وار کیا مجھ پہ کیا دو ہوگئے تلوار کے
دستِ قاتل میں رساؔ تلوار آدھی رہ گئی

ہاتھ ٹوٹیں میں نے جو چھیڑی ہوں زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم دستِ صبا تھا میں نہ تھا

عمر کے آخری دنوں میں اُستاد رساؔ دن کو حاجی ہوٹل میں رہتے تھے اور رات شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر بسر ہوتی تھی۔ آخری دنوں میں انہیں کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ صبر اور قناعت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹتے رہے۔ ان کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ کسی سے کسی طرح کی امداد لیں۔ صرف ایک درخواست دینے کی دیر تھی، انھیں حکومت سے بھی امداد مل سکتی تھی لیکن انھوں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ میر مشتاق صاحب نے ہسپتال میں ان کے داخلے کا انتظام کرادیا تھا لیکن وہ صرف اس لیے ہسپتال میں داخل نہیں ہوئے کہ وہاں طہارت اور پاکیزگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ اپنے مرض پر اپنے علم طب کی ہی آزمائش کرتے رہے۔ ان حالات میں دوسروں کے دکھ درد کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ حاجی میاں نے انہیں ایک کمبل دیا تھا تو اسے ایک روز شیخ کلیم اللہ کے مزار پر ایک عورت کو جا کے اوڑھا دیا جو اپنے بچوں کے ساتھ سردی میں سکڑی پڑی تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے آواز بند ہوگئی تھی، چل پھر بھی نہیں سکتے تھے، بیٹھ بیٹھ کر چلتے تھے۔ اس عالم میں حاجی میاں سے ان کی آخری بات

چیت کاغذ پر لکھ کر ہوئی۔ ان کی یہ آخری تحریر حاجی میاں کے پاس موجود ہے۔ حاجی میاں نے کہا کہ موسم کا تقاضا ہے کہ آج آپ رات ہوٹل پر ہی بسر کرلیں۔ انھوں نے فرمایا، میں اپنی وضع ترک نہ کروں گا۔ اُستاد رساؔ نے حاجی میاں کو یہ بھی لکھ دیا کہ اب یہ مجھ سے گوارا نہیں ہوتا کہ میں آپ کے پانچ روپے کی چرپائی کا نقصان کریں۔ یہ تجارت ہے۔ غرض اسی عالم میں آٹھ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بعد نماز جمعہ ان کا انتقال ہوگیا۔ مغرب کی نماز کے بعد حاجی ہوٹل سے ان کا جنازہ اٹھا۔ جامع مسجد کے پارک میں مولانا یوسف صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور دہلی گیٹ کے باہر نئے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کا جنازہ قبرستان پہنچا تو قبرستان کے باہر ایک ایسی میت رکھی تھی جس کی نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ جو لوگ اُستاد رساؔ دہلوی مرحوم کے جنازے کے ساتھ قبرستان گئے تھے انھوں نے ہی اس میت کی نماز جنازہ بھی ادا کی۔

اُستاد رساؔ کے انتقال کے بعد ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے عقیل ناروی صاحب نے سالانہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اُستاد رساؔ کی یاد میں ہونے والا پہلا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت اس وقت کے وزیر تعمیرات جناب سکندر بخت نے فرمائی، دوسرا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ہوا جس کی صدارت خلیق انجم نے فرمائی۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے اب سات سال بعد پھر آج یہاں اُستاد رساؔ دہلوی کا ذکر خیر ہوا ہے۔

❁❁❁

پنڈت سری واستو

وِدّیا پرکاش سری واستو

پنڈت جی! وِدّیا پرکاش سری واستو سے میرے تعلقات بیالیس سال پرانے ہیں۔ ہم نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے ایک ہی شعبے میں پانچ سال ایک ساتھ کام کیا۔ ان پانچ برسوں کے بعد سے پچھلے پینتیس برسوں میں ہماری ملاقات صرف چار یا پانچ بار ہی ہو پائی ہوگی۔ ہر بار جب بھی ہم ملتے ہیں تو اپنے بیتے ہوئے دنوں کا لطف ہم نے ٹھیک اسی طرح لیا ہے جیسے چالیس سال پرانی بیاہتا عورت کبھی کبھی اپنے پرانے صندوقوں کو کھول کر ان میں رکھے اپنے ان سہاگ کے جوڑوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے جو اپنی پرانی چمک دمک کے ساتھ جیسے کے تیسے بحفاظت رکھے ہوتے ہیں، اس لیے کہ انھیں رُوز روز پہن کر پھاڑ کر ٹھکانے نہیں لگادیا گیا۔ یہ تجربہ اپنے آپ میں بڑا دل چسپ ہے کہ اگر تعلقات کے بیچ لمبے لمبے وقفے آتے رہیں تو ان میں وہ کھٹاس نہیں پیدا ہوپاتی جو کبھی کبھی روز روز کے ملنے سے آجاتی ہے۔ اس کے برعکس ملاقات کے وقفوں سے تعلقات کی گرمی برقرار رہتی ہے، شرط یہ ہے کہ ان تعلقات کے واقعی کچھ معنی ہوں جس کے لیے ایک شخص کا وِدّیا پرکاش اور دوسرے کا اسلم پرویز ہونا ضروری ہے۔ وِدّیا پرکاش

جی میں ایک طاقت ہے لوگوں کو کھینچنے کی، مقناطیس جیسی طاقت۔ اور مجھ میں لوہے کے معمولی کیل کانٹوں جیسا ایک گُن ہے، مقناطیس کی طرف کھنچے چلے جانے کا۔ وِدّیا پرکاش جی اگر کہیں مقناطیس ہونے کے بجائے کسی کے تاج کا ہیرا ہوتے (حالاں کہ ان کی ذات کا جو پرکاش ہے وہ ہیرے سے زیادہ چمک دار ہے) اور میں لوہے کا معمولی سا کیل کانٹا ہونے کے بجائے سونے کی کوئی انگوٹھی ہوتا تو نہ وہ مجھے اپنی طرف کھینچ سکتے اور نہ میں ان کی جانب کھنچ پاتا۔

پنڈت جی، جیسا کہ ان کے اصلی نام وِدّیا پرکاش سری واستو سے ظاہر ہے، اصل میں تو ایک کائستھ ہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ زیادہ تر کائستھ مسلمانوں کی طرح گوشت خور ہوتے ہیں اور کائستھوں کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مغلوں کے زمانے میں وہ سرکاری عہدوں پر بھی کام کرتے تھے جس کے لیے انھیں اس زمانے کی سرکاری زبان فارسی سیکھنی پڑتی تھی۔ انھی دو وجوہ سے یعنی ایک ان کا گوشت خور ہونا اور دوسرے ان کا فارسی داں ہونا، کائستھوں کو آدھا مسلمان کہا جاتا ہے۔ کائستھوں کے مسلمان دوستوں کو یہ قول شاید اچھا بھی لگتا ہو۔ لیکن میں وِدّیا پرکاش جی کو آدھا مسلمان نہیں مانتا۔ انھیں آدھا مسلمان ماننے کا سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ وہ باقی آدھے ہندو ہیں۔ لیکن ہمارے پنڈت جی نہ تو آدھے مسلمان ہیں اور نہ آدھے ہندو۔ میں تو انھیں پورا انسان مانتا ہوں۔ اصل میں سب سے بڑا دھرم تو انسانیت ہی ہے اور دنیا کے بہت سے دھرم اسی ایک دھرم کی شاخیں ہیں۔ جو شخص سچائی کا بندہ ہوتا ہے، اس کی آخری منزل بھی سچ ہی ہوتی ہے چاہے وہ اس سچ تک کسی بھی راستے سے ہوتا ہوا پہنچے۔ جہاں تک میں نے وِدّیا پرکاش جی کو سمجھا ہے دھرم ان کی منزل نہیں، منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر دھرم کی جانب ہم اپنی سوچ میں سدھار لا سکتے ہیں۔

پنڈت جی جنم سے کائستھ ہیں لیکن کہلاتے پنڈت جی ہیں۔ مجھے اس میں کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں نہ تو کسی طرح کا ذات پات کا سا تعصب ہے اور نہ ایسا کوئی لالچ کہ وہ اپنے آپ کو پنڈت جی کہلوائیں۔ یہ تو لوگوں نے ان کے چرتر کو دیکھ کر خود ہی انھیں پنڈت جی، پنڈت جی کہنا شروع کر دیا ہے۔ صرف سبزی خور ہونے سے بھی، جو پنڈت جی ہیں، کوئی پنڈت نہیں ہو جاتا۔ پنڈت تو کہتے ہیں ودوان کو اور اتفاق سے ان کا تو نام ہی وِدّیا پرکاش ہے۔ ماں باپ کے رکھے اس نام کو انھوں نے سچ مچ صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ وِدّیا پرکاش جی پڑھ لکھ کر نوکر ہوئے اور جس پڑھائی کی بنیاد پر وہ نوکر ہوئے وہ ریٹائر ہونے تک کے لیے کافی تھی۔ لیکن پنڈت جی نے کبھی بھی پڑھائی سے اپنا ناتا توڑا نہیں۔ سرکاری دفتر کی افسری کے ساتھ اکادمک سطح کی زندگی بتاتے رہنا اس بات کا پتا دیتا ہے کہ ان کی نظر میں وِدّیا کا یعنی علم کا کیا مقام ہے اور یہ بھی کہ اس کی کوئی آخری منزل نہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں آج کل لڑائی دنگوں کا اصل سبب مذہب یا دھرم ہے۔ لیکن ایک دوسرے کی مار پیٹ کے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور بھی بہانے ہیں۔ بھاشا، پرانت، جاتی اور نہ جانے کیا کیا۔ پنڈت جی اس طرح کے کسی بھی بھید بھاؤ سے بہت اوپر ہیں۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اسے ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اور جس بات کو وہ غلط مانتے ہیں اسے بھی گپ چپ بیان کرنے کے قائل نہیں۔ مجھے یاد ہے، شری لال بہادر شاستری جن دنوں ملک کے وزیر اعظم تھے تو پنڈت جی ایک دن صبح کے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر آئے کہ رات پردھان منتری کے نواس استھان پر ست نرائن کی کتھا ہوئی تھی، شاید ایسا شریمتی للتا شاستری کی خواہش کے کارن ہوا ہو۔ پنڈت جی اس بات سے بہت ناراض تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سیکولر ملک کے وزیر اعظم کا اپنے

سرکاری بنگلے پر ست نارائن کی کتھا کرانے کا کیا مطلب ہے۔ پھر تو وہاں قرآن، گرو گرنتھ صاحب اور بائبل کا بھی پاٹھ ہونا چاہیے۔ اس پر ہم میں سے کسی نے کہا، پنڈت جی اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے، یہ شاستری جی کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس پر فوراً ہی پنڈت جی بول اٹھے تو پھر یہ مُدّا راشٹریہ پریس کے سماچار کالم کا وشے کیوں بنا؟ انھیں یہ کام نجی سطح پر چپ چاپ کر لینا چاہیے تھا۔

پنڈت جی کو ریٹائر ہوئے سولہ برس ہو چکے ہیں لیکن اب وہ پہلے سے بھی زیادہ مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کسی .N.G.O کے رکن ہیں یا نہیں لیکن وہ اپنے آپ میں اکیلے ایک چلتا پھرتا .N.G.O ضرور ہیں۔ وہ صبح سے شام تک لوگوں کے بگڑے کام بنانے کی ادھیڑبُن میں رہتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ لکھتے پڑھتے بھی رہتے ہیں اور باہر کے کسی ملک کا دورہ بھی ہو جاتا ہے۔ جن دفتروں میں وہ کام کر چکے ہیں وہاں آج سولہ سال بعد بھی ان کا سکّہ چلتا ہے۔ کسی کو کوئی کام ہو وہ ہلدی پھٹکری لگے بنا کرا دیتے ہیں۔

آخر میں آپ میرے ستیہ نرائن پنڈت وِدّیا پرکاش سری واستو کی ایک کتھا سنتے چلیے۔ انھی دنوں میں جب ہم ایک ساتھ کام کرتے تھے، میری شادی ہوئی۔ آگے چلنے سے پہلے یہ بتادوں کہ پنڈت جی کے والد ماس کھانے کے معاملے میں پکے کائستھ تھے جب کہ ان کے دونوں فرزند وِدّیا پرکاش جی اور ان کے چھوٹے بھائی سبزی خور تھے۔ لیکن پنڈت جی کے چھوٹے بھائی روز اپنے والد کے لیے بازار سے جاکر خود گوشت لاتے، اسے اپنے ہاتھوں سے پکاتے اور بعد میں والد کے آگے پروستے بھی تھے۔ کوئی پتی ورتا ہندو ناری بھی اپنے پتی کے لیے اس سے زیادہ اور کیا کرے گی۔ دھنیہ ہو اس پتا ورتا سُپتر کو۔ خیر تو پنڈت جی نے میری شادی کی خوشی میں مجھے اور میری بیوی کو اپنے گھر

کھانے کی دعوت دی۔ ہم دونوں یہ سوچتے وہاں پہنچے کہ چلو آج شاکاہاری بھوجن کا مزہ لیں گے۔ لیکن جانے پر پتا چلا کہ ہمارے لیے تو گوشت پکا ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ سب چمتکار پنڈت جی کے چھوٹے بھائی کا ہے جو اپنے بڑے بھائی کی طرح خود بھی شاکاہاری ہیں۔ ہم نے پنڈت جی سے کہا، بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ پھر ہم تو آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے آئے تھے لیکن آپ تو ٹھہرے شاکاہاری، اس لیے آپ تو ہمارے ساتھ کھانے سے رہے۔ اب یہ ہوگا کہ ہم کھانا کھانے سے زیادہ آپ کو کھانا کھا کر دکھائیں گے۔ پنڈت جی فوراً بولے، جی نہیں ہم بھی آپ ہی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ ہم اپنی دال سبزی کھائیں گے اور آپ اپنے ماس مچھی کے ساتھ ہماری دال سبزی کا بھی آنند لیتے چلیے۔ اس طرح ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ جن ہاتھوں سے ہم ماس کھا رہے تھے ہمارے وہی ہاتھ ان کی دال سبزی میں بھی پڑ رہے تھے اور کھانے کے ساتھ مزے مزے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں — ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جب تک ہیں ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے اور یہ دعا کرنی چاہیے کہ یہ دیر تک دھرتی پر انسانیت کا دیپ جلائے رہیں۔

ایک دنیا دوست

عزیز وارثی

یہ اڑتالیس انچاس (۴۹-۱۹۴۸ء) کی بات ہے، ہم ابھی عنفوانِ شباب (adolescence) کی منزل میں تھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمریں تھیں۔ دلّی کی بساطِ تہذیب و ادب ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بالکل ملیامیٹ ہو کر نئے سرے سے انگڑائیاں لیتی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُردو زبان و ادب کا کاروبار ایک بار پھر تیزی سے گرم ہونے لگا تھا۔ اس کا ایک اہم سبب پاکستانی پنجاب سے نقلِ وطن کر کے آنے والے وہ مہاجرین بھی تھے جو اُردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہوئے آئے تھے۔ ان مہاجرین میں دکان دار بھی تھے جنھوں نے پہلے پہل یہاں آ کر اپنی دکانوں میں اُردو ہی کے سائن بورڈ لگائے مثلاً مہاشے دی ہٹی کا نام ہم نے پہلے پہل اُردو ہی میں لکھا دیکھا تھا۔ ڈھابے والے اور ٹھیلوں پر سودا بیچنے والے بھی، کلفی (قلفی)، ریوڑی اور چھولے بھٹورے والے بھی اپنے ٹھیلوں اور ڈھابوں پر اُردو کی تختیاں لگائے دکھائی دیتے تھے۔ جو صحافی وہاں سے آئے وہ بھی اُردو کے 'پارس'، 'چترا ویکلی'، 'ملاپ' اور 'پرتاپ' جیسے اخبار اور رسالے ساتھ لائے۔ پی.ٹی. کالج اور کیمپ کالج کھلے تو وہ بھی اُردو اور فارسی کے شعبوں کے ساتھ۔ جن

میں پڑھانے والے بھی پنجاب کے غیر مسلم مہاجر اساتذہ تھے۔ میری اور خلیق انجم کی نئی نئی یاری انھی دنوں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مشاعرے بھی خوب ہوتے تھے، غرض ہمیں اپنے اسکول کی پڑھائی لکھائی میں تو بس واجبی ہی سی دلچسپی تھی لیکن ادب اور شعروشاعری کی محفلوں میں گھس بیٹھ کا چسکا ہمیں اچھی طرح لگ چکا تھا۔ اس زمانے میں فلمی رسالوں میں 'شمع' اور ادبی رسالوں میں 'جمالستان' ہم شوق سے پڑھتے تھے۔ یوں مختلف رسالوں کے دفتروں کے چکر لگانا ہمارا عام مشغلہ تھا۔ 'جمالستان' کی کاپی ہم بازار سے خریدنے کے بجائے براہِ راست 'جمالستان' کے دفتر سے جاکر خریدتے تھے جس کا مقصد ادارۂ جمالستان کے اُن لوگوں سے شرف ملاقات حاصل کرنا بھی تھا جن کے کالم ہم شوق سے پڑھتے تھے۔ تو ایک دن جب ہم بازار مٹیا محل میں 'جمالستان' کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچے تو رسالے کے نائب مدیر زاہد صاحب کی میز کے سامنے ایک صاحب وہاں پہلے سے براجمان تھے۔ ہم بھی برابر کی دو کرسیوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ زاہد صاحب نے ان صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا، "آپ ہیں جناب عزیز وارثی۔" عزیز وارثی صاحب نے اپنی کرسی کو، جو زاہد صاحب کی میز کے متوازی رکھی ہوئی تھی، ذرا ترچھا کیا تاکہ وہ ہم کو بھی توجہ دے سکیں۔ سر پر گھونگھریالے گھنے کالے بال، اتنی ہی گھنی کالی مونچھیں، آنکھوں پر سیاہ کمانی کا چشمہ، سفید ململ کا کرتا، لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ اور پیروں میں وارنش کا سیاہ چمکتا ہوا پنجرے دار پمپ، چھریرا بدن، سانولا رنگ، یہ تھے عزیز وارثی۔ مرتے دم تک ہم نے انھیں اسی وضع قطع میں دیکھا اِلّا اس کے کہ جاڑوں میں وہ سیاہ اچکن اور زیب تن کرلیا کرتے تھے۔ جب ہلکے جاڑے شروع ہوتے تو اچکن سے پہلے کچھ دنوں کے لیے سیاہ واسکٹ کا دور چلتا۔ آگے چل کر جب بہت عرصے تک انھیں دیکھنے، ان سے ملنے، ان سے بات کرنے اور ان کے ساتھ ادبی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ وہ لباس ہی نہیں زندگی کے ہر معاملے میں انتہائی وضع

دار قسم کے انسان تھے اور اپنی ان وضع داریوں کو انھوں نے زندگی کے آخری سانس تک انتہائی خوش اسلوبی سے نبھایا خواہ اس کی انھیں کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑی ہو۔ خیر تو یہ وہ زمانہ تھا کہ ہم شعروشاعری کی لت میں مبتلا ہوچکے تھے اور خود بھی موزوں طبع ہونے سے پہلے ہی الٹے سیدھے شعر کہنا اور بے تکی تک بندیاں کرنی شروع کردی تھیں۔ ہم نے فوراً ہی عزیز وارثی صاحب سے فرمائش کی کہ اپنا کلام سنائیں۔ ہم جیسے نوعمر اور نوآموزوں کو عام طور پر اونچے لوگ آسانی سے خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن عزیز وارثی صاحب کے ہاں ہم نے ایسا کوئی طمطراق نہیں دیکھا۔ چناں چہ انھوں نے ہماری فرمائش پر ترنم کے ساتھ اپنی غزل شروع کردی، جس کا مطلع یہ ہے:

سننے کی بات ہے نہ سنانے کی بات ہے
ان کے ہمارے عشق کی جو واردات ہے

ان کی زبان سے سنا ہوا ان کا یہ مطلع آج پچپن چھپن برس بعد بھی میرے حافظے میں جوں کا توں محفوظ ہے۔ اڑتالیس انچاس میں سنی ہوئی ان کی اس غزل کے بارے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ غزل ان کے کلیات میں ردیف 'ی' کی ۶۹ غزلوں میں سے تیرہویں غزل ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کے کلیات میں کلام کی زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کسی شاعر کے فنی اور ذہنی ارتقا کے جائزے میں اس طرح کی معلومات نقاد کے لیے کافی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ عزیز وارثی کا تعلق سلسلۂ صوفیہ سے بھی تھا۔ وہ حاجی اوگھٹ شاہ وارثی کے مرید تھے اور اسی نسبت سے وہ عزیز احمد خاں سے عزیز وارثی ہوئے۔ کہنا یہ ہے کہ اگر انھیں وارثیہ سلسلے سے باقاعدہ کوئی نسبت نہ ہوتی تو بھی تصوف ان کے مزاج، ان کی سرشت اور ان کی زندگی کے روؤں میں شامل اور داخل تھا۔ صوفی کی ایک بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں دین کے معنی تلاش کرتا ہے اسی لیے صوفی کا رشتہ

دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت ہے، ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگوں کا وہ ہجوم جو ہم صوفیا کی خانقاہوں کے گرد دیکھتے ہیں۔ دنیا کے ساتھ صوفی کا یہ تعلق دنیادار کا سا نہیں دنیا دوست کا سا ہوتا ہے۔ عزیز وارثی کے ہاں تصوف کے معنی ہی دنیا دوستی تھے۔ دنیاداری — حرص و ہوا، خودغرضی اور امارت کا کارخانہ ہے اور دنیا دوستی! ایثار، خدمت اور قناعت کی روش ہے۔ دنیا دوستی خدا کے اس لامحدود تصور کی ٹھنڈی چھاؤں میں سانس لیتی ہے جہاں اسے یعنی خدا کو تمام عالموں کا رب کہا گیا ہے۔ دنیا دوست سب کا دوست ہے۔ وہ اچھوں سے دوستی کرتا ہے اور بُروں کو بھی اچھا بنانے کے لیے وہ بُروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے، ان کے ساتھ اپنی اچھائیاں بانٹنے کے لیے۔ ایثار پسندی خودغرضی کی کاٹ ہے، قناعت انسان کو حرص و ہوس کے حملوں سے محفوظ رکھتی ہے، خدمت سے جو روحانی کیف و انبساط نصیب ہوتا ہے امارت اس کے پاؤں کی دھول ہے۔ یہ تمام باتیں ان لوگوں کی سمجھ میں بہ آسانی آسکتی ہیں جنھوں نے عزیز وارثی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ نئی نئی خواہشات نے انسان کو مصنوعی قسم کی ضروریاتِ زندگی کے جال میں جکڑ کر رکھ دیا۔ نئے نئے طرز کے لباسوں نے لوگوں کی پرانی ہیئتیں ناقابلِ شناخت حد تک بدل کر رکھ دیں۔ عزیز وارثی ہر اعتبار سے جہاں سے شروع ہوئے تھے وہیں پر آکر ختم ہوئے۔ انھوں نے ہمدرد کی ملازمت سے دلّی میں اپنی زندگی شروع کی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے مقرب خاص ہونے کے باوجود وہ ہمدرد کے ملازم ہی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ورنہ تو کنور صاحب کے حلقہ بگوش تو زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو ان سے مادی منفعت اٹھانا چاہتے تھے اور اٹھاتے بھی تھے۔ عزیز وارثی نے شاعری بھی منڈی کی مانگ کے تحت شروع نہیں کی تھی، وہ تو لڑکپن کی عمر سے بچھرایوں ہی سے شعر کہتے ہوئے دلّی پہنچے تھے۔ وہ زبان کی باریکیوں سے بھی واقف تھے اور فن کے نکات و رموز سے بھی۔ اس کے علاوہ جو چیز

انسان کو حقیقی معنی میں بڑا، مشہور یا مقبول شاعر بناتی ہے وہ خداداد ہے۔ چناں چہ ایک صوفی ہی کی اسپرٹ کے ساتھ انھوں نے شعر و ادب کے میدان میں زبردستی اپنے آپ کو اونچا اٹھانے یا رضائے الٰہی کے معاملات میں بلاوجہ مخل ہونے کی کوشش میں وہ مصنوعی حربے استعمال نہیں کیے جہاں آج کے اکثر فن کار اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھے داموں بیچنے کے لیے اُس اخلاقی برہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ٹی.وی. اشتہارات کو بھی شرما دے۔ اس لیے قحط الرجال کے اس دور میں عزیز وارثی اور انھی جیسے ایسے اور لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں دنیا عام طور پر یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتی کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں، ایک ایسا ماڈل ہیں جنھیں دکھا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیکھو انسان ایسے ہوتے ہیں۔ عزیز وارثی نے تصوف کے ایک ادنا طالب علم کی حیثیت سے پہلا سبق یہی سیکھا کہ آسمانوں کی بلندیوں کو چھو لینے کا انحصار تو توفیقِ الٰہی پر ہے لیکن جو بات انسان کے بس میں ہے بلکہ ایک طرح سے اس کی ذمے داری بھی ہے وہ یہ کہ دنیا میں، جہاں وہ مخلوقِ خدا کے ساتھ رہتا ہے، ایک اچھا انسان بن کر دکھائے، ایک سچا دنیا دوست:

عزیز وارثی جو تم بھی ابن الوقت ہوجاتے
تمھارا تذکرہ بھی داستاں در داستاں ملتا

میں عزیز وارثی کے بارے میں اب تک جو گفتگو کرتا رہا اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ان کے بارے میں کوئی خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ ان کے بارے میں جو کچھ بھی اوپر لکھا گیا وہ دراصل ان کی شخصیت، ان کی سیرت اور ان کی شاعری کا بین السطور ہے۔ ان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے۔ شراب پینے والے کو شاعرانہ اصطلاح میں عام طور پر رندِ بے باک کہا جاتا ہے۔ بے باکی شخصیت کا ایک بڑا جوہر ہے اور رند کے ہاں یہ جوہر مستِ مے ناب ہونے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہماری شاعری کا

ایک عام مضمون ہے جس کا تعلق بالواسطہ طور پر اعلا اخلاقیات سے ہے۔ عزیز وارثی شراب پی کر بے باک ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، وہ بے باکی کے ساتھ شراب ضرور پیتے تھے۔ ان کا مے نوش ہونا نہ کوئی راز تھا اور نہ ان کے بارے میں کسی قسم کا قیاس یا وہم۔ وہ صحیح معنوں میں ایک رندِ بے ریا و بے باک تھے۔ غالب نے کہا تھا:

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازہ گفتار نہ دارد

غالب کے اس قول کی رُو سے گویا شراب عزیز پر حرام نہیں تھی۔ انھوں نے زندگی بھر اپنی تمام نجی، خاندانی اور سماجی ذمے داریاں اسی شغلِ مے نوشی کے ساتھ نبھائیں۔ انھوں نے شراب کے لیے اپنا گھر نہیں پھونکا۔ انھوں نے شراب کے پیچھے اپنے بیوی بچوں کو عاجز اور بیزار نہیں کیا، انھوں نے شراب نوشی کے سبب اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کی اگر کوئی لغزشِ حسنہ ہے تو یہی کہ انھوں نے یہ کام ریاکاری کے پردے میں نہیں کیا۔ غرض انھوں نے اپنی دنیا دوستی کے مسلک کا دامن شراب نوشی کے باوجود ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ داغ نے کہا تھا:

کی ترک مے تو مائلِ پندار ہوگیا
میں توبہ کرکے اور گنہ گار ہوگیا

عزیز وارثی جس صفائے باطنی کے ساتھ شغلِ مے نوشی کرتے تھے، اس کا اشارہ ان کے اس شعر میں ملتا ہے:

مری شفاف پیشانی نے میری لاج رکھ لی ہے
مجھے کیا کیا سمجھتے تم جو سجدوں کا نشاں ملتا

ان کا یہ شعر ان کے اس صوفی مزاج کا آئینہ ہے جس میں وہ رچے بسے ہوئے تھے۔
عزیز وارثی کے اس شعر پر جوش ملیح آبادی کی نظم 'مولوی' کا یہ شعر یاد آتا ہے:

سجودِ بے ریا ماتھے کی بندی
درودِ باصفا ہونٹوں کا پوڈر

دہلی میں ایک شاعر ہوا کرتے تھے بسمل شاہجہانپوری جو دلّی پولیس میں ملازم تھے لیکن اس قدر کے پابندِ صوم و صلوٰۃ کہ کبھی وردی نہیں پہنی، شرعی پاجامہ اور کرتا پہن کر عمر بھر ڈیوٹی نبھائی اور پولیس لائن میں صرف ڈاک پہنچانے کے کام پر مامور رہے۔ وہ شاعر تو بس ایسے ہی تھے لیکن ان کی ایک غزل نے ایک زمانے میں بڑی دھوم مچائی تھی جس کا ایک شعر شراب سے متعلق یہ ہے:

طلوعِ جام پر اے دل کوئی بے ساختہ سجدہ
وہ سجدہ جس کو لینے رحمتِ پروردگار آئے

اس شعر میں متصوفانہ مسلکِ عشق کی مہک تو ہے بشرطیکہ یہ شعر بسمل شاہجہاں پوری کا نہیں کسی صاحبِ طریقت کا ہو، لیکن شاعر مذکور کو بھلا اس کی باریکیوں سے کیا سروکار، وہ طریقت سے دور کا علاقہ بھی نہیں رکھتے تھے اور شریعت کی پٹری کے شکنجے میں اپنے آپ کو کس کر رکھتے تھے اس لیے اس شعر کے تعلق سے ان کی مثال ایک گنبد کی سی تھی اور ان کا یہ شعر اس گنبد میں کہیں باہر سے آئی ہوئی صدا کی محض بازگشت تھا۔ اس شعر سے عزیز وارثی کے 'شفاف پیشانی' والے شعر کا بھلا کیا مقابلہ جو شاعر کی سیرت کی سچی عکاسی ہے۔

عزیز وارثی چھوٹوں سے یوں جھک کر ملتے تھے تاکہ ان سے ان کی سطح پر آکر بات کرسکیں۔ بڑوں سے بھی جھک کر ملنا وہ یوں ضروری سمجھتے تھے کہ کہیں ان کا سر بزرگوں کی سطح سے اوپر نکل جانے کی گستاخی نہ کر بیٹھے۔ نوجوانوں کے ساتھ وہ شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے کندھے سے کندھا ملاکر چلتے تھے۔
اور ذرا رواداری اور دنیا دوستی کا یہ نمونہ بھی تو ملاحظہ کیجیے:

رہ زندگی میں لطیف تر یہ اصول میں نے بنا لیا
جو ہر ایک نگاہ میں خار تھا اسے پھول میں نے بنا لیا

میرا خیال ہے کہ عزیز وارثی نے شعر گوئی کا مسلک نہ شہرت کے لیے اختیار کیا نہ دولت کے لیے اور نہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہونے کے لیے کہ شعر و ادب کی دنیا میں ہم بھی کوئی خاں ہیں۔ ایک صاحب طرز شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا ایک انفرادی طرزِ بیان تھا اور وہ یہ کہ وہ حسن و عشق اور شباب و شراب کے پامال مضامین کو بھی ایک سنجیدہ اور شائستہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ وہ شعر کی زبان میں زیادہ تر اپنی نجی اخلاقیات بیان کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ماورائے سخن باتیں اور بین السطور میں اپنی بات بیان کرنے کی مثالیں ان کے کلام میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دلّی والیوں کی زبان میں 'وہ بڑے انسان آدمی تھے'۔ عزیز وارثی کو جب جب ہم ان کی یادوں میں اپنے قریب پاتے ہیں تو مومن کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

مومن آیا ہے بزم میں تیری
صحبتِ آدمی مبارک ہو

آخر میں عزیز وارثی کی برہمیِ مزاج کا ایک قصہ اور سنتے چلیے، یہ جاننے کے لیے کہ ان کے ہاں برہمی بھی کس طرح کی ہوا کرتی تھی۔ یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب بلراج مین را، سریندر پرکاش، کمار پاشی، بھوشن بن مالی، کیول سوری وغیرہ اُردو ادب کے افق پر angry youngmen کی صورت میں طلوع ہو رہے تھے۔ اُردو بازار میں میر مشتاق صاحب کے کمرے، اردونا ہال، مہر علی تعلیمی مرکز پر انجمنِ تعمیرِ اُردو کی تنقیدی ادبی نشست کا سلسلہ جاری تھا۔ اس ادبی نشست میں بلراج مین را اپنی ایک کہانی سنا رہے تھے اور اس روز اتفاق سے، اور یہ اتفاق بعض ہنگامی حالات میں اکثر ہو جایا کرتا تھا، منشی عبدالقدیر صاحب اپنی بزرگی کے ساتھ اپنے کھدر کے سفید لباس، سفید پگڑی اور سفید بھک داڑھی

سمیت نشست کی صدارت فرما رہے تھے۔ کہانی ختم ہونے کے بعد جب اس پر تنقید بحث کا آغاز ہوا تو اندازہ ہوا کہ کہانی اکثر قارئین کے سر سے گزر گئی تھی۔ اس پر بحث کے دوران تھوڑی افراتفری بھی مچی۔ اسی دوران کہیں صاحب صدر نے بھی یہ فرما دیا کہ اگر کوئی ادیب یہ چاہتا ہے کہ اس کی بات اس کے سامعین اور قارئین تک پہنچے تو اسے مہمل گوئی سے احتراز کرنا ہی چاہیے۔ اس پر تو بلراج مین را آگ بگولہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور گلزار دہلوی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ ایسے کھوسٹوں کی صدارت میں ہم سے اپنی تنقیدی نشست میں کہانیاں پڑھواتے ہیں جو مہمل اور علامتی کے فرق کو بھی نہیں جانتے۔ عزیز وارثی بھی اس نشست میں موجود تھے اور اب تک خاموشی سے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ یہ سب تماشا دیکھتے رہے لیکن جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ بلراج مین را نے منشی عبدالقدیر کو کھوسٹ کہا جن کی درازیِ عمر اور یہ سلسلہ روزگار بھی ان کی عزت کرتے تھے تو فوراً غصے میں لال ہو کر کھڑے ہو گئے اور بلراج مین را سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، 'سن بے او ادیب کی دم، یہ منشی عبدالقدیر ہیں نا، یہ چاہے ادیب ہوں یا نہ ہوں لیکن ہمارے لیے ہر اعتبار سے لائقِ تعظیم ہیں۔ اگر اس کے بعد ان کے بارے میں تم نے منہ سے کوئی اور ناشائستہ لفظ نکالا تو تمھیں اٹھا کے کوٹھے سے نیچے پھینک دوں گا۔' یہ اس نشست کا وہ نقطۂ عروج تھا جہاں سے پھر طوفان تھمتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں سکون ہو گیا۔ عزیز وارثی نے بھی مین را سے معذرت کر لی اور سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ تو عزیز وارثی کے مزاج میں ایک موجِ خوں ایسی بھی تھی جس کے مشاہدے کا موقع مجھے زندگی میں بس ایک بار ملا۔

❁❁❁

کارواں اور غبارِ پسِ کارواں

پروفیسر مسعود حسین خاں

'کتاب نما' کے ایک شمارے میں خامہ بگوش کی ایک دل چسپ تحریر نظر سے گزری۔ اپنی اس تحریر میں خامہ بگوش نے کشور ناہید کی خودنوشت 'بری عورت کی کتھا' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ آپ بیتی کے بارے میں لکھا ہے:

> "گزری ہوئی زندگی کو لفظوں میں مقید کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ انسان جس بنیاد پر یہ کام کرتا ہے وہ بہت کم زور ہے۔ حافظہ انسان کا ساتھ کبھی دیتا ہے اور کبھی نہیں اور بعض اوقات تو صریحاً دھوکا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمزور بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائے گی اس کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب زمین بوس ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر آپ بیتیاں منہدم عمارتوں کے ملبے جیسی نظر آتی ہیں اور ان سے اندازہ نہیں ہوتا کہ اصل عمارت کیسی تھی۔" ('کتاب نما' نومبر ۱۹۹۵ء، ص ۴۳)

بیتیوں اور آپ بیتیوں کے بارے میں خامہ بگوش کی رائے اس سے بھی وقیع سمجھی جانی چاہیے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کی تالیفات کا مطالعہ ان کا ایک محبوب مشغلہ ہے،

جس کا ثبوت ہے ان کے ذاتی کتب خانے میں سوانح عمریوں اور خودنوشتوں کا بیش بہا ذخیرہ۔ مندرجہ بالا اقتباس کا یہ تیکھا جملہ کہ اکثر آپ بیتیاں منہدم عمارتوں جیسی نظر آتی ہیں، خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ یہاں لفظ 'اکثر' کا استعمال نہ صرف یہ بتاتا ہے کہ خامہ بگوش کا قلم سنبھل سنبھل کر چلتا ہے بلکہ اس سے ان کے نظریے میں مستثنیات کی گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے۔

'بری عورت کی کتھا' جیسے عنوان میں وہی ریاکارانہ انکسار ہے جس کا اظہار مہذب لوگ اپنے بارے میں لفظ خاکسار کے استعمال سے کرتے ہیں۔ اس کے برعکس پروفیسر مسعود حسین خاں کی خودنوشت سوانح حیات کے عنوان 'ورودِ مسعود' کے دونوں لفظ یعنی ورود اور مسعود اپنے اپنے connotation کے اعتبار سے ایک طرح کی تکریم اور برتری کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

لغوی اعتبار سے اگرچہ ورود اور وارد ہونا اکثر حالتوں میں مسعود یا کم از کم ناگوار عنرور قرار پاتا ہے۔ اس عنوان میں کسی قسم کے ریاکارانہ انکسار کے برعکس وہ بے باکانہ اظہار ہے جس میں 'من آنم کہ من دانم' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ 'ورودِ مسعود' کے عنوان میں تعلّی کی وہی شان ہے جو غالب اور مومن جیسے شاعروں کے بعض مقطعوں میں نظر آتی ہے۔

یہاں 'ورودِ مسعود' پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ مسعود صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے جب میں 'ورودِ مسعود' پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کے بعض اندراجات سے لگتا ہے کہ میں اور میرے دوست خلیق انجم ایک عرصے سے مسعود صاحب کا پیچھا کرتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان کے ساتھ ہم دونوں کا تعلق کارواں اور غبارِ پسِ کارواں جیسا ہے۔ یہاں غبارِ پسِ کارواں کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی طرح

کے مصنوعی عجز و انکسار سے کام لے رہا ہوں۔ 'غبارِ پس کارواں' کی وقعت کا اندازہ اس فارسی شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

چوں در بطحا سوارِ ناقہ را ناگاہ می بینم
من از چشم تمنائی غبارِ راہ می بینم

۱۹۳۹ء میں اینگلو عربک کالج سے بی.اے پاس کر کے مسعود صاحب ایم.اے میں داخلہ لینے علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک اسکول سے دسویں جماعت پاس کر کے میں اور خلیق انجم انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر میں داخلے کے لیے علی گڑھ آئے۔ مسعود صاحب نے اسٹریچی ہال میں لگے داخلے کے بازار کا جو ذکر کیا ہے، ویسا ہی بازار ۱۹۵۰ء میں اسٹریچی ہال میں ہمیں لگا ہوا ملا۔ داخلے کی کارگزاری میں جس طرح مسعود صاحب کی رہ نمائی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کی تھی بالکل اسی طرح ہم دونوں کو بھی فرشتہ رحمت کی طرح وہیں اسٹریچی ہال میں ایک سینیر مل گئے ان کا نام تھا فضل حق تمنا۔ یہ صاحب انتہائی مہربان ثابت ہوئے چناں چہ بارہ بجے تک ہم داخلے، ڈائننگ ہال اور ہاسٹل کے کاغذات حاصل کر کے ممتاز ہاسٹل پہنچے جو اسی آفتاب ہال کا ایک ہاسٹل ہے جس کے آفتاب ہاسٹل میں ہم سے پہلے مسعود صاحب رہ چکے تھے۔

۵۳-۱۹۵۲ء کا تعلیمی سال علی گڑھ میں ہمارا بی.اے کا آخری سال تھا۔ ہمارے اُردو نصاب میں اقبال کی 'بالِ جبریل' شامل تھی۔ مسعود صاحب اسی سال ولایت سے لوٹ کر آئے تھے اور شعبۂ اُردو میں ریڈر کے عہدے پر فائز تھے — انھوں نے ہمیں 'بالِ جبریل' پڑھانی شروع کی۔ پہلے دن جب وہ کلاس میں آئے تو ہمارا سامنا مسعود صاحب کی انتہائی دل کش شخصیت سے ہوا۔ گورا چٹا رنگ، قد اتنا دراز جیسے ابھی ابھی سرو چمن سے تخلیق بندگی لکھوا کر آرہے ہوں، مغربی لباس زیب تن، سر پر اس وقت بھی اتنے

ہی بال تھے جتنے آج ہیں۔ چشمہ آنکھوں پر اس وقت بھی تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے ہونٹ اس وقت بھی ایسے ہی متبسم انداز میں کھلتے تھے جیسے آج۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز تب بھی ویسا ہی تھا۔ چہرہ مہرہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا جیسے آج ہے بس اب ذرا درازیٔ عمر کے سبب خفیف سی مرجھاہٹ نظر آتی ہے اتنی ہی جتنی صبح کے خریدے ساگ سبزی پر شام تک آجاتی ہے۔ آواز میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح، خدا بری نظر سے بچائے، سامنے کے نظر آسکنے والے دانت سلامت ہیں ویسی ہی دائیں بائیں اوپر نیچے کی خفیہ ڈاڑھیں بھی ہوں گی۔ دراصل بعض لوگوں کی کاٹھی ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ عمر کے ہر دور میں ماشاءاللہ ٹخنی کے لاٹھی ہی رہتے ہیں اور 'نجیب الطرفین' پٹھان تو خاص طور پر۔ مسعود صاحب تو یہ ذہنی طور پر grow کرنے میں اتنے منہمک رہے ہیں کہ جسمانی عمر رسیدگی کی انھیں تو وہ فرصت ہی نہیں ملی۔ ہاں تو ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مسعود صاحب نے ہمیں بی.اے میں 'بالِ جبریل' پڑھانی شروع کی۔ سرسید ہال میں شعبے کی قدیم عمارت کے پیچھے ظہور وارڈ اور یونین آفس کے درمیان جو گھاس کا میدان ہے، مسعود صاحب جاڑوں کی سہانی دھوپ میں وہیں کلاس لیتے تھے۔ وہ اپنی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھاتے تھے۔ کرسی کی پشت روسٹرم کا کام انجام دیتی تھی۔ مسعود صاحب نے سب سے پہلے اقبال کی نظم مکالمہ ابلیس و جبریل پڑھائی۔ اس نظم میں ابلیس اور جبریل کے کرداروں کے مطابق اقبال نے دونوں کے لب و لہجے میں جو امتیاز پیدا کیا ہے اس کی جانب مسعود صاحب نے نظم کی قرأت کے ذریعے ہماری توجہ مبذول کرائی۔ مثلاً پہلا ہی شعر:

ہم دمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟
سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!

مسعود صاحب نے اس طرح پڑھا کہ پہلے مصرعے سے اضطراب ناآشنا جبریل کا استعجاب اور دوسرے سے دنیاوی کلفتوں کا نظارہ کرنے والے ابلیس کا وجدان دونوں صاف جھلکتے تھے۔ مسعود صاحب کے اندازِ تدریس کا پہلا ہی نقش اتنا بھرپور تھا کہ آج چالیس سال گزرنے کے بعد حافظے پر اس نقشِ اوّل کے سوا بقیہ تمام نقوش دھندلا سے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم مسعود صاحب سے یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کے شاگرد رہے ہیں تو وہ ہماری بات مان تو لیتے ہیں لیکن انھیں یہ یاد نہیں آتا کہ ہم کب ان کے شاگرد رہے اور یہ صورت حال ان کے بہت سے شاگردوں کے درمیان رہی ہے۔

مسعود صاحب کا شمار ان گنے چنے اُردو دانوں میں ہے جنھوں نے لسانیات کی جانب پہل کی اور اسے اپنی علمی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ اس طرح جب اُردو میں لسانیات میں دلچسپی لینے کا رواج عام ہوا تو مسعود صاحب کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے بھی اس سمت میں بڑھنا شروع کیا۔ خلیق انجم دہلی یونیورسٹی کے اُردو والوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے لسانیات میں کامیابی کے ساتھ ڈپلوما کورس پورا کیا۔ کامیابی کے ساتھ اس لیے کہ اس سے پہلے کئی اُردو والے اسی ڈپلوما کورس میں داخلہ لے کر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ پھر اس کے چار سال بعد دہلی یونیورسٹی کے اُردو والوں میں وہ پہلا شخص میں تھا جس نے لسانیات میں ایم لٹ پاس کیا۔ مسعود صاحب اپنی علمی زندگی کے بہت سے معرکے سر کرتے ہوئے آج ایک اعلا منصب پر ہیں۔ جہاں تک غبارِ پسِ کارواں کا تعلق ہے، اس غبار کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک عین کارواں سے لپٹا ہوا غبار جو بگولے کی شکل اختیار کرتا ہوا بھنورایا ہوا سا کارواں ہی کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے اور دوسرا اس بگولے کے پیچھے کا وہ غبار جو زمین سے اٹھ اٹھ کر بیٹھتا رہتا ہے اور ہانپتا کانپتا سا بگولے کی قیادت میں کارواں کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ غبارِ پسِ کارواں کی ان دونوں سطحوں کو

آپ بالترتیب خلیق انجم اور اسلم پرویز کا نام دے سکتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے 'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کی جب ادبی حلقوں میں دھوم مچی تو مولوی وحید الدین سلیم نے بڑی حسرت سے ایک ملاقات میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے یہ کہا کہ ہمیں کوئی ایسا شاگرد نہ ملا جو ہم پر خاکہ لکھتا۔ یہ تو تھی شاگردی کا حق ادا کرنے کی بات لیکن مسعود صاحب تو ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے استادی کا حق ادا کر دیا۔ 'وردِ مسعود' میں ڈاکٹر خلیل بیگ کے بارے میں انھوں نے محبت، شفقت اور خیرخواہی کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، اسے پڑھ کر رشک آتا ہے اور طبیعت یہ سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے پورے دور ملازمت میں ایسا کوئی مشفق اور سرپرست نہ ملا جو ہمارے لیے خیرخواہی کے اسی جذبے کے ساتھ کبھی کچھ سوچا کرتا۔

'وردِ مسعود' کے پہلے باب میں مسعود صاحب نے اپنے خاندان، اپنی ولادت اور بچپن کا ذکر کیا ہے۔ وہ پٹھان ہیں اور ان کا تعلق سرحد کے آزاد قبائلی علاقے سے ہے۔ خلیق انجم خود کو روہیلہ بتاتے ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ہم سرحدی یوسف زئی پٹھان ہیں اور ہمارے اجداد سوات سے یہاں آئے تھے۔ اس پر لگے ہاتھوں ایک لطیفہ سنتے چلیے۔ جب ہم پہلے پہل علی گڑھ پہنچے تو ہماری انٹروڈکشن نائٹ میں ہم سے یہ سوال کیا گیا کہ ہماری ذات کیا ہے۔ ہم نے کہا، پٹھان، اس پر کسی اور سینیر نے پوچھا کہ آپ کہاں کے پٹھان ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ کابل کے۔ ایک اور سینیر نے فوراً فقرہ جڑا کہ اتنا تو کابلی چنا ہوتا ہے جتنے بڑے آپ ہیں۔ یقیناً مسعود صاحب کو اپنے انٹروڈکشن میں ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا ہوگا۔ یہ ایک ہی مادے سے مشتق دو مختلف المعانی الفاظ والی صورت ہے۔

ان بکھری ہوئی باتوں کو سمیٹتے ہوئے ایک بات اور یاد آئی، خاصی دلچسپ ہے۔
ہم اردو میں ایک محاورہ استعمال کرتے ہیں، دودھ کا دھلا ہوا۔ اگرچہ دودھ کا دھلا ہوا سے مراد صاف ستھرا اور بے عیب ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ محاورہ ہمیشہ طنزیہ طور پر الٹے ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور عیب و ریا داغی کا مطلب ادا کرتا ہے مثلاً 'جی ہاں، آپ تو جیسے دودھ کے دھلے ہوئے ہیں۔' ایسی صورت میں مسعود صاحب جیسی ٹرانسپیرنٹ شخصیت کو دودھ کا دھلا ہوا کہنے کی نادانی یا گستاخی میں کیسے کرسکتا ہوں، ہاں ان کی شیرخواری کے زمانے کی رعایت اور دودھ اور دھلے کے تعلق سے انھیں دھوبن کا دودھیایا ہوا ضرور کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ شعر آپ کو یاد دلاتا چلوں:

طفل میں خو بو ہو کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

مسعود صاحب کے زمانے میں اگرچہ ڈبے کا دودھ اور سرکار کی تعلیم دونوں عام ہوچکی تھیں۔ مسعود صاحب ڈبے کے دودھ کی وبا سے اس امر کے باوجود محفوظ رہے کہ ان کی والدہ کے پاس ان کی اشتہا کے لائق دودھ نہ تھا جس کی بنا پر انھیں اپنے گھر کی دھوبن کا دودھ پینا پڑا۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کہا کہ انھیں دھوبن کا دودھیایا ہوا کہا جاسکتا ہے۔ دھوبن کا دودھ پینے کا نتیجہ تھا کہ مسعود صاحب ڈبے کے دودھ کی لعنت سے محفوظ رہے اور ان میں ماں باپ کی پٹھانی خو بو باقی رہی۔ چناں چہ شاید دھوبن کے دودھیائے ہونے ہی کا اثر ہے کہ انھوں نے 'وردِ مسعود' میں کئی لوگوں کو خوب دھوبی پاٹ دکھایا ہے۔

مجھے مسعود صاحب سے قربتیں حاصل نہیں رہیں، لیکن وہ میرے لیے اجنبی کبھی

نہیں رہے اور اب تو میں بھی ان کے لیے کچھ زیادہ بیگانہ نہیں اور شاید آج کے بعد تو بالکل نہیں۔ خلیق کا کہنا ہے کہ مسعود صاحب نجی ملاقاتوں میں خوب کھل کر بات کرتے ہیں۔ گویا وہ خرد و بزرگ کی غیر رسمی بیٹھک میں اپنے مقام اور منصب کا تاج دربار کے تھکے ہوئے بادشاہ کی طرح سر سے اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں اور پھر بے تکلف گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قائم گنج کے پٹھان جب بے تکلف گفتگو کرتے ہیں تو اس میں کیا چٹخارہ ہوتا ہے اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے اس لیے ہے کہ میں علی گڑھ اور جامعہ کے بہت سے قائم گنجی پٹھانوں کے ساتھ تھوڑا بہت اٹھا بیٹھا ہوں۔

کارواں اور پس کارواں کی رعایت سے اس بات چیت کے آخر میں مجھے ایک بات یہ کہنی ہے کہ میں اتنا مہذب نہیں کہ اپنے بارے میں یہ کہوں کہ میں تو مسعود صاحب کے پیروں کی دھول بھی نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر میرے اور مسعود صاحب کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ ایک عالم اور ایک اچھا استاد شہسوار کی طرح اپنے اثرات کا غبار اڑاتا ہوا چلتا ہے لیکن غبار بننے کی توفیق ہر ایک کو نہیں ہوتی۔ پیارے ذرات ہی غبار بن بن کر اڑتے ہیں جو اپنے ساتھ ساتھ اس کارواں کا بھی پتا دیتے ہیں جو ان سے آگے آگے ہے۔

✿✿✿

نثار احمد فاروقی

کل کی سی بات ہے، نثار احمد فاروقی ہمارے درمیان تھے آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ جس وقت اُردو اکادمی، دہلی نے دِتی والے (سلسلہ۔۴) کے سہ روزہ سیمنار کا منصوبہ بنایا اس وقت یہ بات ہم میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ اس سیمنار کے ہوتے ہوتے نثار احمد فاروقی بھی اس سیمنار کا ایک موضوع بن چکے ہوں گے اور اب ایک اندوہناک صورت حال یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ بھی اس سیمنار میں کسی پر اپنا مضمون یا خاکہ پیش کرتے خود ان پر اس سیمنار میں خاکہ پڑھا جا رہا ہے۔ نثار احمد فاروقی اُردو، فارسی، عربی کے عالم، ہندی اور انگریزی کے ماہر، تصوف کے شناور اور مجلسی زندگی کی جان تھے۔ سینکڑوں حکایات اور لطائف ان کی نوک زبان پر، اُردو اور فارسی کے ہزارہا اشعار انھیں اس طرح ازبر کہ ہر موقع ومحل کا شعر ہر وقت حاضر۔ غرض یہ توفیق بھی ہر شخص کو کہاں کہ نثار احمد فاروقی کے کمالات فن پر بات ہی کرسکے۔ اس لیے نثار پر بات کرنے کا آسان راستہ یہی ہے کہ ان کے کمالاتِ فن کو ایک طرف رکھ کر صرف ان کی شخصیت اور ذات کے بارے میں دو چار باتیں کرلی جائیں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے،

میں نے نثار احمد فاروقی سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن وہ کتنا اور کچھ مجھے یا دوسروں کو سکھا سکتے تھے اس کا اندازہ ان کے ساتھ پچاس برس کی رفاقت کے باوجود آج تک میں نہیں لگا سکا۔

میر تقی میرؔ ابتدا ہی سے نثار کے محبوب شاعر تھے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میر اور نثار دونوں میں چند صفات مشترک تھیں یعنی دونوں بے دماغ، آشفتہ سر اور پراگندہ طبع۔ چناں چہ جواں سالی ہی میں میرؔ کے سینکڑوں اشعار ان کے ورد زبان تھے۔ میں نے میرؔ کے بیشتر اشعار پہلے پہل نثار ہی کی زبانی سنے اور انھیں براہِ راست پڑھنے کا موقع بعد میں ملا۔ ایسے ہی اشعار میں میرؔ کا یہ مشہور قطعہ بند بھی ہے اور شاید اسی کے ساتھ نثار کی زبانی میرؔ کے اشعار سننے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ قطعہ بند یہ ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُرغرور تھا

کیا یہ قطعہ بند والا معاملہ محض ایک اتفاق تھا یا کچھ اور، اس بات کا سلسلہ میں نے مضمون کے آخر میں ملانے کی کوشش کی ہے۔

دسمبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے، میں اور ڈاکٹر خلیق انجم علی گڑھ سے تازہ تازہ بی اے پاس کرکے دِتی لوٹے تھے۔ دِتی یونیورسٹی میں داخلوں کا موسم جولائی میں شروع ہوتا ہے، اس میں ابھی پورے آٹھ مہینے باقی تھے۔ اس دوران اس آزمائش اور تجربے سے گزرنے کا اچھا موقع تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ انہی دنوں مشہور فلمی رسالے ماہنامہ 'شمع' کے دفاتر میں ایک نئے پرچے ہفت روزہ 'آئینہ' کے اجرا کی

تیاریوں کے ساتھ ایک نئی فصلِ گل آئی تو ایک اور قیدی کی صورت میں میں بھی یہاں آپہنچا۔ نثار احمد فاروقی پہلے ہی اس زنداں کو آباد کیے بیٹھے تھے اور ان کے یہاں سے چھوٹ نکلنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ بہرحال 'آئینہ' کے اجرا کی تیاریوں کا سلسلہ دفتر میں زوروشور سے جاری تھا۔ اس دوران دفتر کے لوگوں میں سے جس شخص نے سب سے زیادہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ یہی نثار احمد فاروقی تھے۔ دفتر کے اس کلرکستان میں مجھے ان کا وجود صحرا میں نخلستان جیسا لگتا تھا۔ انتہائی شائستہ مذاق، پُرلطف گفتگو اور رچا رچایا ادبی ذوق اور اس پر طرفہ تماشا ان کا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ مزاج۔ غرض ان کی شخصیت کی یہ رنگا رنگ خصوصیات میرے اندر ایک لطیف قسم کا ہیجان اور ولولہ پیدا کرنے کا سامان ثابت ہوئیں۔ میں چوں کہ ابھی خود کو طفلِ مکتب ہی سمجھتا تھا اس لیے اپنی حیثیت کے تناظر میں نثار کو ادبی مذاق کے اعتبار سے ایک مکمل شخصیت کے روپ میں دیکھا تھا لیکن یہ مکمل شخصیت خود اپنے آپ کو کتنا تشنہ اور ناآسودہ سمجھتی تھی میں نے یہ تماشا بھی بارہا دیکھا ہے۔ نثار صاحب کی شیروانی کی جیب میں ایک ڈائری ہوا کرتی تھی۔ اور باتوں کے علاوہ اس ڈائری کا ایک اہم مصرف یہ بھی تھا کہ دوسروں سے سنے ہوئے ایسے اشعار جو انھیں اچھے لگتے تھے فوراً ڈائری میں نوٹ کرلیا کرتے تھے اور اس میں کوئی عرفیؔ، نظیریؔ اور خاقانیؔ کی قید نہیں تھی۔ ایک آدھ بار تو انھوں نے اسلم پرویز تک کا شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کرڈالا تھا۔ بہرحال ادبی مذاق کے اعتبار سے میرا وجود ابھی گندھی ہوئی مٹی کے اس لوندے جیسا تھا جو کمہار کے چاک پر اس انتظار میں گھوم رہا ہوتا ہے کہ کب کمہار کی انگلیوں کا مس اس کے اندر سوئے ہوئے سنگیت کو جگاتا ہے اور اسے گھڑ کر کچھ سے کچھ بناتا ہے۔ یوں تو جیسا تیسا شعر کہنا مجھے چار پانچ برس پہلے ہی اسکول کے زمانے میں آچکا تھا اور بعد میں علی گڑھ کی ہاسٹل کی زندگی میں مزاج کی شوخی اور

شرارت کو بھی خاصی دھار لگ چکی تھی لیکن ان کیفیات کے شعری مذاق اور بذلہ سنجی میں ڈھل جانے کے لیے ابھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی۔ زندگی کا یہی وہ موڑ تھا جہاں میری مڈبھیڑ اس کیمیاگرِ بذلہ سنجی سے ہوئی جس کا نام نثار احمد فاروقی ہے۔ دراصل جس چیز کو ہم بذلہ سنجی کہتے ہیں اس میں بہت بڑا دخل تربیت اور ریاض کا بھی ہے۔ تربیت انسان کی تقدیر ہے اور ریاض اس کی تدبیر۔ تقدیر اگر چوکھی ہو تو کبھی کبھی تدبیر کے معاملے میں آدمی غفلت بھی برت جاتا ہے۔ میرا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ اینگلو عربک اسکول کے زمانے میں' میرے فارسی کے استاد سید وزیرالحسن عابدی اور اُردو کے استاد مولانا رہبر پرتاپ گڑھی کی شفقتیں یا 'شمع' کے دفتر میں نثار احمد فاروقی، ظ۔ انصاری اور بسمل سعیدی جیسے لوگوں کی قربتیں اور صحبتیں جو آگے چل کر دائمی تعلق کی شکل اختیار کرگئیں اور انجمن تعمیر اُردو کی مستقل نشستیں گویا میرے لیے تربیت کا سامان فراہم کرتی رہیں۔ آگے چل کر صدیق الرحمٰن قدوائی اور رشید حسن خاں جیسے صلاح کار ہاتھ آئے اور انھی کے ساتھ ساتھ چابک بردار کی حیثیت سے جناب خلیق انجم بھی برابر دوڑانے میں لگے رہے۔ اب جہاں تک ریاض کا معاملہ ہے تو جس طرح اسکول سے بھاگنے والے بچوں کے لیے آج تک کوئی گولی ایسی ایجاد نہیں ہوئی جو پڑھائی میں ان کا جی لگا سکے، ٹھیک وہی معاملہ ریاض کا بھی ہے جو ہمیشہ سے انسان کی افتادِ طبع کے رحم و کرم پر رہا ہے۔ مگر بھلا ہو تربیت کے معاملے میں اس بھلی تقدیر کا کہ اس نے مار پیٹ کر آج اس قابل بنا ہی دیا کہ اکثر 'خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر'... معاف کیجیے میں یہاں سطور میں بین السطور کا بکھیڑا لے بیٹھا، تو چلیے واپس چلتا ہوں اس ترکیب بند سے ترجیع بند کی طرف یعنی نثار احمد فاروقی۔

'آئینہ' کی رسمِ اجرا کے سلسلے میں ایک شاندار جلسہ اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس دور

کی ادب کی تمام قدآور شخصیتیں، اور وہ دور تھا بھی زیادہ تر قدآور شخصیتوں ہی کا، اس جلسے میں موجود تھیں۔ ان میں کون ایسا تھا جس سے نثار احمد فاروقی واقف نہ ہوں یا نثار احمد فاروقی کو وہ نہ جانتے ہوں۔ نام تو میں نے بھی بہت سوں کے سن رکھے تھے لیکن ہر شخصیت پر اس کے متعلقہ نام کو چسپاں کرنے کا دلچسپ مشغلہ اس محفل میں مجھے نثار احمد فاروقی ہی کے ذریعہ ہاتھ آیا۔ نوکری کرتے فی الواقع ابھی 'جمعہ جمعہ آٹھ دن' ہوئے تھے اس لیے میرے اندر کا وہ 'لڑکا آوارہ منش آزاد سیلانی' ابھی تک زندہ تھا چناں چہ میں اس ادارے کا ادنیٰ درجے کا ملازم ہونے کے باوجود ایک منچلے نوجوان کی طرح اس جلسے میں آٹوگراف بک لیے گھوم رہا تھا۔ اگلی نشست کی ایک کرسی پر ایک صاحب شیروانی پہنے اور اسی کے ساتھ ٹوپی لگائے تشریف فرما تھے۔ نثار صاحب نے اشارہ کیا کہ وہ مالک رام صاحب ہیں، ماہرِ غالبیات۔ یہ نام میرے لیے انجانا تھا اور ماہرِ غالبیات کے نام پر تو میں نے علی گڑھ کی پارٹ ون کی اُردو کلاس میں اپنے استاد ظہیر الدین علوی صاحب کی زبان سے صرف حالی، بجنوری اور غلام رسول مہر کے نام سنے تھے۔ بہرحال میں اشتیاق اور حیرت سے ملے جلے جذبے کے ساتھ اپنی آٹوگراف بک لے کر مالک رام صاحب کی طرف بڑھا۔ ان سے آٹوگراف کی فرمائش کا ابھی آدھا ہی جملہ میں ادا کر پایا تھا کہ مالک رام صاحب نے ترخ کر جواب دیا، 'معاف کیجیے میں اس گوں کا آدمی نہیں ہوں'۔ اس طرح مالک رام صاحب کی دوٹوک شخصیت سے متعارف ہوا۔ میں نے بعد میں نثار صاحب سے پوچھا بھی کہ کیا آپ ان کے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات تو میں ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو بات انھیں گوارا نہیں ہوتی اس کا وہ دوٹوک جواب دیتے ہیں لیکن یہ ان کے بارے میں میں کیا کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب کس بات کا دوٹوک جواب دے بیٹھیں گے۔ نثار احمد فاروقی کے 'ذکرِ میر'

کے اردو ترجے 'میر کی آپ بیتی' کی پہلی اشاعت میں جو ۱۹۵۷ء میں منظرِ عام پر آئی تھی، مالک رام صاحب کا مقدمہ شامل ہے۔ اس بات کو آج اڑتالیس برس ہوگئے۔ ان اڑتالیس برسوں میں نثار احمد فاروقی نے علم کے کوہ گراں کی اور کتنی چوٹیاں سر کرلی ہوں گی، اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ میں نثار کو دیکھ کر ایک ایسے پرندے کا تصور کرتا ہوں جو انڈے کے خول ہی سے پرواز کرتا ہوا باہر آیا ہو اور یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ نثار احمد فاروقی کوئی اسطور نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھے۔

نثار احمد فاروقی کا تعلق امروہہ کے جس گھرانے سے تھا وہ علمی اعتبار سے متمول اور اقتصادی طور پر خودکفیل ہے۔ چنانچہ وہ جب اپنی بقچی بغل میں داب کر دلّی جیسے بڑے شہر کی طرف روانہ ہوئے تو اس سفر کا تمام تر مقصد دیہات اور قصبات سے آنے والے عام لوگوں کی طرح حصولِ تعلیم و معاش ہی نہیں تھا۔ دراصل امروہہ سے تو انھیں بھگا کر لائی ان کی آشفتہ سری۔ ویسے علم اور روزگار کے میدان میں خوب سے خوب تر کی جستجو ایک دانش ورانہ ناآسودگی کا خاصہ بھی ہے۔ چنانچہ نثار کی زندگی میں یہ عمل اسی نہج پر جاری رہا۔ میر کی جانب نثار کا جھکاؤ کچھ خواہ مخواہ ہی نہیں ہے۔ دونوں کے مزاج میں کسی درجہ ہم آہنگی ہے۔ میر کی سی بے دماغی اور میر کی سی شورشِ جنوں کے آثار کبھی کبھی اس پراگندہ طبع کے ہاں بھی دکھائی دیتے تھے، لیکن معتقدِ میر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شاید پیروِ غالب بھی تھے اسی لیے ان کی نگاہوں میں دلّی سے آگے جادہ راہ فنا کے علاوہ کوئی افق نہیں، کوئی لکھنؤ نہیں، کوئی حیدرآباد نہیں تھا۔

قلندری کی شان صرف ملنگ بنے رہنے میں نہیں ہے ورنہ یہ بات کیوں کہی جاتی، ''اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند'' شاید اپنے مزاج کی فرماں برداری اور فرماں روائی سے بڑی قلندری کوئی نہیں ہے اور نثار نے اپنی ذات کی تمام تر خوبیوں اور کمزوریوں کے

ساتھ اسی طرح زندگی گزاری ہے بقول سید انشاء:

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

مشہور کمیونسٹ لیڈر رگیہ دت شرما جو وائی.ڈی. کے نام سے مشہور تھے، کمرشل ایمپلائز یونین کے صدر تھے، ان کا دفتر آصف علی روڈ پہ دفاتر 'شمع' کی بغل میں تھا۔ تو ہوا یوں کہ آخر ایک دن ٹریڈ یونین دفاتر 'شمع' میں بھی پہنچ ہی گئی۔ اس کے فوری ردعمل کے طور پر ملازموں کی برطرفی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی ریلے میں نثار صاحب بھی معطل کردیے گئے اور اس طرح کہ ادارہ انہیں کسی صورت واپس لینے کو تیار نہ تھا۔ اس پر لیبر کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک نثار صاحب مع تنخواہ معطل رہیں گے۔ اسی دوران انھیں دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ایک ملازمت مل گئی جو نثار صاحب کے مرتبے کے لائق نہ سہی 'شمع' کی نوکری سے بہرحال بہتر تھی۔ اب گویا یہ کتابوں کی کھان میں جا بیٹھے۔ لائبریری کو مستفید کرنے والے تو ان سے بہتر اور درجنوں کلرک تھے لیکن خود لائبریری سے حد درجہ مستفید ہونے والے شاید یہ تنہا اسٹاف ممبر تھے۔ نثار احمد فاروقی کبھی لائبریری وقت پر نہیں پہنچتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ دیر گئے رات تک لالٹین کی روشنی میں بیڑیاں پھونک کر مطالعے میں غرق رہتے، صبح دیر سے سو کر اٹھتے، نہا دھو کر گلی قاسم جان سے بلی ماران کا رُخ کرتے، حویلی حسام الدین حیدر سے تھوڑا آگے چل کر اسی ہاتھ پر حافظ ہوٹل تھا جس میں نثار صاحب ماہانہ ادھار پر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر چلتے ہوئے کاؤنٹر پر حافظ جی سے تقاضا ہوتا ''لاؤ بھئی حافظ جی دو روپے دینا''۔ حافظ جی یہ دو روپے بھی ان کے ادھار کھاتے میں درج کردیتے۔ یہ دو روپے نثار صاحب کا دن بھر کا جیب خرچ تھا یعنی بس کا آنے جانے کا کرایہ، بیڑی

کا بنڈل اور ماچس اور دو بار کی چائے۔ لائبریری میں نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم اور میں، ہم تینوں کا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا تھا۔ خلیق انجم، نثار صاحب کو اکثر یہ کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کہ ''یار امروہے سے جو آتا ہے وہ مصحفی پر ہی کام کرتا ہوا آتا ہے۔'' لائبریری کی بغل میں وینگرز ریستوراں ہوا کرتا تھا جہاں ہم لوگوں کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس ریستوراں میں امروہہ کے ایک ویٹر تھے شہباز خاں، وہی ہماری خدمت کرتے تھے۔ ایک روز جب ہم چائے پینے گئے تو شہباز خاں نے نثار صاحب سے دریافت کیا ''میاں آپ کے پاس مصحفی کا دیوان ہے کیا۔'' نثار صاحب کی طبیعت ہی اس سوال سے منغض ہوگئی۔ خلیق صاحب نے مزے لیتے ہوئے برجستہ پوچھا، ''خاں صاحب، آپ کو مصحفی کا دیوان کس لیے چاہیے۔'' خاں صاحب کا جواب تھا، ''جی مجھے مصحفی پر کچھ کام کرنا ہے۔'' اس بات کا لطف ہم لوگوں نے کس قدر لیا ہوگا اور خاں صاحب کا یہ جواب سن کر نثار کس درجہ بے کیف ہوئے ہوں گے، آپ اندازہ کرسکتے ہیں۔ دلی یونیورسٹی لائبریری میں نثار صاحب کے ایک سیکشن انچارج تھے سود صاحب۔ دیر سے آنے پر نثار صاحب کے ساتھ ان کی روز کی جھک جھک تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ معاملہ ایک روز یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین پروفیسر داس گپتا صاحب تک پہنچ گیا۔ داس گپتا صاحب انتہائی علم دوست قسم کے انسان تھے۔ وہ نثار صاحب کے علمی مرتبے سے واقف تھے۔ انھوں نے نثار صاحب کو اپنے کمرے سے رخصت کیا اور سود صاحب سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب نثار صاحب چلے گئے تو داس گپتا صاحب نے سود صاحب کو سمجھایا کہ اگر ہمارے اسٹاف میں کوئی صاحب علم آدمی آپھنسا ہے تو ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نظم وضبط اور ڈسپلن کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔ ڈسپلن کی لکڑی ہانکنے کو آپ کے اور بہت سے ماتحت ہیں، نثار صاحب ان سب سے الگ ہیں۔ آپ

ان کے لگام نہ کسا کریں۔ سود صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس آگئے۔ اگر ان میں شے لطیف کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو برجستہ کہہ سکتے تھے، "گویا میں انھیں بے لگام چھوڑ دوں۔" اس دن کے بعد سے سود صاحب نثار صاحب کے دیر سے آنے پر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے لیکن منہ سے کچھ نہ بولتے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز نثار صاحب کچھ زیادہ ہی دیر سے لائبریری پہنچے۔ سود صاحب نے ان سے تو کچھ نہیں کہا، انھیں دیکھ کر متواتر دیوار پر ٹنگے گھنٹے کو دیکھتے رہے۔ نثار صاحب نے ان کی اس حرکت پر جھلا کر اپنے امروہوی لہجے میں گھنٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "دیکھو کیا رہا! گلے میں ٹانگ لے اس کو۔" دلّی یونیورسٹی لائبریری کے مقابل فیکلٹی آف آرٹس میں شعبۂ اردو کے مسندِ صدارت پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اورنگ زیب بنے بیٹھے تھے اور لائبریری کی ایک خستہ حال سی میز کرسی پر نثار احمد فاروقی سرمد صفت براجمان تھے۔ چنانچہ بعض لوگ اسی دہلی یونیورسٹی سے ایسے بھی نکلے جو اورنگ زیب کے سکھائے اور سرمد کے پڑھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آج بھی ہرے بھرے ہیں اور خوب پھل پھول رہے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں "نقل کفر کفر نہ باشد"، خواجہ احمد فاروقی یا نثار احمد فاروقی کے دستخط سے دستخط ملا لینا شعبدہ تو ہوسکتا ہے کمال نہیں۔ جن لوگوں کا علم گہرا ہوتا ہے وہ اپنی علمی معلومات کو ٹریڈ سیکریٹ کی طرح چھپائے نہیں پھرتے بلکہ سورج کی طرح اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی کو برابر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ دراصل علم پر سوار ہونے اور علم کو اپنے اوپر سوار کرنے کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ جن لوگوں پر علم سوار رہتا ہے وہ اس کے بوجھ تلے دبے آس پاس والوں پر دولتیاں ہی جھاڑتے رہتے ہیں اور جو لوگ شہ سواروں کی طرح علم پر سوار ہوکر چلتے ہیں تو ان کے تو راستے کی گرد بھی طالبانِ علم کی آنکھوں کا سرمہ بن جاتی ہے۔

بسمل سعیدی صاحب کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ بلا کے سخن شناس تھے۔ دلّی میں بے شمار لوگوں نے تو ان سے اس طرح فیض اٹھایا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ کچھ اسی قسم کے تجربات سے نثار صاحب بھی گزرتے رہے ہیں۔ نثار احمد فاروقی اور بسمل صاحب کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ جوش جیسا شاعر بھی بسمل صاحب کی سخن دانی کا معترف و مداح تھا۔ اب اگر بسمل صاحب جیسا آدمی بھی نثار احمد فاروقی کو علامہ کہے تو کوئی بات تو ہے۔ جب جامع مسجد کے ادبی ٹھکانے، خصوصاً "چنڈو خانہ" ایک ایک کرکے ختم ہوگئے تو بسمل صاحب بارہ ہندو راؤ سے بلاناغہ ہر شام دلّی کالج ہاسٹل علامہ نثار احمد فاروقی کے کمرے پر پہنچتے تھے۔ کچھ اپنی باتوں سے نثار صاحب کو سیراب کرنے اور کچھ ان کی باتوں سے اپنی پیاس بجھانے۔ جب دوستوں کے بے حد اصرار پر نثار احمد فاروقی نے اپنی رسمی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا تو آناً فاناً تمام منزلیں طے کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی بن بیٹھے۔ جی ہاں اسی آرٹس فیکلٹی میں خواجہ احمد فاروقی کے بغل والے کمرے میں۔ یہ ویسی ہی صورتِ حال تھی جہاں نادر شاہ کے حملۂ دہلی کے بعد ایک رات ایسی گزری جب نادر شاہ اور محمد شاہ دونوں لال قلعے میں قیام پذیر تھے۔ بقول آنند رام مخلص:

چہ عجب بازیِ شطرنج بہ دست فلک

یک مملکتِ ہند دو خسرو دارد

ایک دوسرے سے متصل یہ شریعت و طریقت کا عجیب سنگم تھا۔ ایک طرف تو خواجہ احمد فاروقی کی شریعت تھی جہاں اس دیارِ گنگ و جمن میں تیمم بھی خلافِ شرع تھا اور دوسری طرف نثار احمد فاروقی کی طریقت تھی جہاں لباسِ برہنگی میں بھی نمازِ عشق ادا ہوسکتی تھی۔

نثار احمد فاروقی کھانے پینے کے بھی بہت شوقین تھے اور دلّی کے کھانوں کے خاص طور پر۔ اور جب وہ دلّی کے ان کھانوں کی بُری گت ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو ان سے نہیں رہا جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے کا ذکر ہے دلّی کی نہاری کی بات ہورہی تھی۔ نثار صاحب نے ایک دم بدمزہ ہوتے ہوئے کہا، اب دلّی میں نہاری پکانے والے کہاں رہے۔ پرانی دلّی میں ہر چوتھی دوکان اب نہاری کی ہے، صبح نہاری، شام نہاری اور نہاری کسی کو پکانی آوے نا۔ ڈھیر مرچیں جھونک دے ویں ہیں کھانے والا سی سی کرکے کھا جاوے ہے پتہ ہی نہ چلتا کہ کیا کھا گیا۔ ایک مرتبہ خلیق انجم اور نثار احمد فاروقی حیدرآباد میں تھے۔ معلوم ہوا یہاں فلاں دوکان پر بڑی عمدہ نہاری ملتی ہے۔ چنانچہ صبح ہی صبح یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور نہاری کا آرڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں بیرا نہاری لے کر آیا تو ڈھیر سارا شوربہ اور بڑے کا ایک سالم پایہ پلیٹ میں رکھا تھا۔ ان دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں اسی کو نہاری کہتے ہیں۔ نثار صاحب نے بیرے کو جو نہاری رکھ کر چلا گیا تھا، آواز دے کر واپس بلایا اور کہا کہ "دیکھ بھئی اب ہم پھنس گئے ہیں تو اسے کھا لیتے ہیں۔ مگر آئندہ کسی دلّی والے سے نا کہہ دیجیو کہ یہ نہاری ہے۔"

جب سے نثار احمد فاروقی دلّی کے پرانے شہر کو خیرباد کہہ کر اوکھلا میں بٹلہ ہاؤس جا بسے تھے، ان سے ملنا بس کبھی کبھار کا رہ گیا تھا لیکن اگر کبھی وہ خاص دوستوں کی دعوت کرتے تھے یا ان کے گھر میں کوئی تقریب ہوتی تھی تو مجھے مدعو کرنا کبھی نہ بھولتے تھے اور یہی دستور میرا بھی تھا۔ دس بارہ سال پہلے میری بیٹی کی شادی ہوئی تو میں نے نثار صاحب کا دعوت نامہ شعبۂ عربی کے پتے پر دلّی یونیورسٹی بھیج دیا۔ ان دنوں وہ شعبۂ عربی سے کچھ غیر حاضر تھے، دعوت نامہ انھیں نہیں ملا اور وہ شادی میں نہیں آسکے۔ مجھے ان کی غیر حاضری کا سخت رنج رہا کہ دیکھیے بلانے پر بھی نہیں آئے۔ ادھر نثار کو کسی سے پتہ چلا

کہ اسلم کی بیٹی کی شادی تھی تو انھیں یہ قلق ہوا کہ دیکھو اسلم کی بیٹی کی شادی ہوئی اور مجھے یاد نہیں کیا، حالاں کہ شادی کا دعوت نامہ ان کے شعبے کی ڈاک میں پڑا دھول چاٹ رہا تھا۔ تو ایسے تھے ہمارے تعلقات۔

"بزرگی بہ عقل است نہ کہ بہ عمر" فارسی کا یہ مقولہ نثار صاحب کے ساتھ رہ کر سمجھ میں آیا۔ میں، خلیق انجم، نثار احمد فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی اور ایسے ہی کئی اور احباب، ہم سب عمر کے اعتبار سے لگ بھگ ایک ہی جھول کے ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ نثار کی مثال تو ایک ایسے پرندے کی سی تھی جو انڈے کے خول ہی سے پرواز کرتا ہوا باہر آیا ہو۔ یہاں شاہ نصیر دہلوی کا ایک قطعہ یاد آتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ قطعہ شاہ نصیر نے اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب انھوں نے ایک حسینہ کو بجے سجائے رتھ پر کہیں جاتے دیکھا تھا۔ رتھ پر بیضوی شکل اور رنگ کا ایک کاٹھ کا گنبد تھا اور اس گنبد پر ایک سنہری کلس جگمگا رہا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

اُس کے رتھ کا کلس سنہری دیکھ
شب کہا ماہ سے یہ پروین نے
بہر پرواز کیا نکالی ہے
چونچ بیضے سے مرغ زریں نے

اس اعتبار سے نثار ہم میں سے بہتوں سے کافی آگے ہیں اس لیے کہ ہم نے انڈے کے خول سے باہر آکر جتنا عرصہ پَر پُرزے نکالنے میں لگایا اتنے میں تو یہ طائرِ لاہوتی بن چکے تھے۔

'وقت کوتاہ قصہ طولانی'۔ آخر میں صرف ایک بات اور عرض کردوں۔ ایک دوست اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ نثار صاحب سے گزارش کی کہ اشاعت

کے لیے دینے سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ ایک نظر اس مسودے پر ڈال لیتے۔ نثار صاحب نے فرمایا کہ بھائی اب میں شہر چھوڑ کر دور بٹلہ ہاؤس میں جا بسا ہوں۔ کچھ مصروفیت بھی بڑھ گئی ہے، اگر یہ کام آپ مجھ پر چھوڑیں گے تو معاملہ لیت ولعل میں پڑ سکتا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اسلم پرویز آپ کے گھر سے بہت نزدیک ہیں، وہ بسمل سعیدی کے صحبت یافتہ ہیں۔ آپ میری ذمہ داری پر یہ مسودہ ان کو دکھالیں۔ یہاں صاحب مسودہ کے اطمینانِ خاطر کے لیے نثار صاحب بجا طور پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ میرے اور بسمل سعیدی کے صحبت یافتہ ہیں مگر نثار کو بھلا اس اعزاز کی کیا ضرورت تھی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نثار احمد فاروقی کی جان ہڈیوں کے کینسر کے موذی مرض نے لی۔ میں نے اس گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ میں نے نثار کی زبانی میر کا جو کلام سنا اس میں شاید سب سے پہلے میر کا یہ قطعہ بند تھا:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُرغرور تھا

اب ان کے مرض الموت کے کچھ دن پہلے کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے دفتر اُردو گھر میں خلیق انجم، نثار احمد فاروقی اور میں محوِ گفتگو تھے کہ اچانک ایک نوجوان وارد ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور حیدر دہلوی پر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ حیدر دہلوی کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ حیدر دہلوی کا ایک مقطع میرے حافظے میں کبھی کا پڑا ہوا تھا، میں نے کہا کہ سرِ دست حیدر دہلوی کا ایک مقطع سن لیجیے جو مجھے یاد ہے۔ اور یہ کہہ کر میں نے حیدر دہلوی کا وہ مقطع

سنا ڈالا۔ یہ مقطع سن کر ان صاحب پر، جو ایم فل، پی ایچ. ڈی قسم کے کوئی اسکالر تھے، تو کچھ اثر نہ ہوا لیکن نثار احمد فاروقی کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل پڑی۔ آج ان کے انتقال کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کیا اس شعر پر ان کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بے ساختہ واہ واہ کوئی صدائے غیب تو نہیں تھی۔ حیدر دہلوی کا مقطع یہ ہے:

پسِ صحرا نوردی، ہڈیوں کا ڈھیر ہیں حیدر
کہ میلا ہو گیا تھا جامۂ ہستی اتار آئے

جن لوگوں نے نثار احمد فاروقی کو قریب سے نہیں دیکھا، ان کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے:

"افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی"

❂❂❂

رشید حسن خاں

دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی روایت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے لیکن روایت کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ایک سا نہیں ہوتا۔ بے شمار لوگ تو وہ ہیں جو اپنی روایت سے بے خبر اور بے گانے ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں روایت کے زمانی ضابطوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور جو روایت کے بارے میں ایک طرح کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو روایت پرست کہا جاسکتا ہے۔ روایت پرستوں کو اس وقت زبردست بحران کا سامنا ہوتا ہے جب کسی عبوری دور کے زمانی ضابطے روایت کے چراغوں کی لو کو مدھم کر دیتے ہی جب کہ روایت پرست صرف انھی چراغوں کی روشنی میں راستہ چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جن کی شخصیت میں روایت کا امتزاج عقلی اور جذباتی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ گویا ان کے ہاں روایت کا عرفان اور احترام بھی ہوتا ہے اور اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی۔ انھی لوگوں کو صحیح معنوں میں روایت کا امین کہا جاسکتا ہے۔ روایت کی مختلف جہات ہیں اور علاحدہ

علاحدہ سیاق وسباق میں اس کی الگ الگ سطحیں ہیں۔ اس لیے کسی فرد واحد کے تعلق سے روایت کی تخصیص بھی ضروری ہے۔ اور جب تذکرہ رشید حسن خاں کا شروع ہوا ہے تو آپ یقیناً یہاں میرے ہم خیال ہوں گے کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جو ہماری قدیم ادبی روایت کے امین ہیں۔ روایت کی یہ امانت ان تک اور ان کے ساتھ ان کے کئی دوسرے ہم عصروں تک حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسی شخصیتوں کے واسطے سے پہنچی ہے۔ روایت پرست اور روایت کے امین کے درمیان خط کھینچنا اس لیے ضروری تھا کہ ہم واضح خطوط پر اپنی بات آگے چلائیں۔ روایت کے امین کا کام روایت کو، جو ماضی کی امانت ہے، حال کی وساطت سے مستقبل تک پہنچانا ہے جو اس کا حقیقی وارث ہے۔ اس اعتبار سے گویا کسی روایت کے امین کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ماضی سے اپنی پیوستگی اور حال سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی نیابت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں اس لیے کہ یہاں تمام تر لیاقت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویّے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ذہنی رویّہ ہے روایت کے معاملے میں ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو جھٹک کر الگ کر دینے کا، ایک سائنٹفک نقطۂ نظر اختیار کرنے کا اور حال کی ناگزیر حقیقتوں کو کھلے دل اور دماغ کے ساتھ تسلیم کرنے کا۔ مختصر یہ کہ اس ذہنی رویّے کا دوسرا نام ہے روشن دماغی۔ رشید حسن خاں یقیناً قدیم ادبی روایت کے پرستار اور دل دادہ ہیں۔ ان کی اب تک کی تمام زندگی اس روایت کو گلے لگا کر گزری ہے، یہاں تک کہ زندگی کے ایک خاص موڑ پر انھوں نے اس روایت کی خدمت کو مشغلۂ حیات بنالیا۔ چناں چہ پچھلے لگ بھگ پینتیس سال سے ادبی مشاغل ان کا اوڑھنا بھی ہیں اور بچھونا بھی۔ لیکن اس میدان میں ان کی شہرت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ باصلاحیت ہونے

کے ساتھ ساتھ روشن دماغ بھی ہیں۔

تحقیق ایک سنجیدہ اور علمی مشغلہ ہے، اگرچہ بعض لوگوں کی نظر میں یہ ایک انتہائی خشک موضوع ہے۔ رشید حسن خاں ایک خوش طبع انسان ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک کھلا ذہن رکھتے ہیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زمانۂ موجود کے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر تحقیق ان کا موضوع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دقیانوسیت کی مکڑی نے ان کے گرد اپنا جال بن کر انھیں اس میں قید کر دیا ہو اور وہ ایسے ہی کرم کردہ سے لگنے لگے ہوں جیسی کرم خوردہ کتابوں سے انھیں عام طور پر واسطہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے قدیم ادب کے بہت سے گوشوں پر سے مکڑی کے جالے صاف کر کے انھیں آج کے سورج کی دھوپ دکھلائی ہے۔

رشید حسن خاں جب دلّی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سرسید روڈ پہ سرسید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی.ڈی.اے کا وہ بل ڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا۔ چناں چہ روزانہ شام کو دہلی کی بیشتر ادبی شخصیتیں اُردو بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے ارونا ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔ رشید حسن خاں کے ساتھ میری اور خلیق انجم کی تقریباً روزانہ شام کو یہیں ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہم دونوں سرسید روڈ پر ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔ خلیق انجم اس زمانے میں کروڑی مل کالج سے وابستہ ہو چکے تھے اور میں بھی اپنے پی ایچ.ڈی کے کام کے سلسلے میں تقریباً روز ہی دہلی یونیورسٹی جاتا تھا۔ لہٰذا اکثر دن کے اوقات میں بھی خاں صاحب کے ساتھ کیمپس میں ملاقات رہتی تھی۔ یہ تعلق رفتہ رفتہ ایک دوستی کے رشتے میں

بدلتا گیا۔ اس طرح رشید حسن خاں سے جو قربتیں حاصل ہوئیں ان کے ذریعے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے — علمی پہلو بھی اور انسانی پہلو بھی — اور ہر پہلو انتہائی دل چسپ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک باصلاحیت، روشن خیال اور دوست دار قسم کے انسان ہیں۔

اس گفتگو کے آغاز میں رشید حسن خاں کے تعلق سے روایت کے امین کا جو تذکرہ چھڑا تھا اسی کی روشنی میں رشید حسن خاں کے بارے میں ایک بات یہ کہنی ہے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری جھولی میں اپنی روایت کا جو کچھ بھی سرمایہ ہے، اسے ہمیں پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے خردوں میں تقسیم کرتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب ادب کے طالب علموں کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی نسل روایت کے مستقبل کے سفر کی ساتھی ہے۔ جن لوگوں کو رشید حسن خاں سے قربت حاصل ہے اور جو ان سے مسائل ادب پر صلاح مشورہ کرتے رہتے ہیں، ان کی تحریر و تقریر پر رشید حسن خاں کے کان اور نگاہ برابر لگے رہتے ہیں تاکہ ان کے ہاں اگر کہیں کوئی کوتاہی ہے تو وہ اس سے انھیں برملا آگاہ کر دیں۔ نوجوانوں کی وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ وہ ان کے لیے نئے نئے موضوعات بھی تجویز کرتے ہیں اور متعلقہ ماخذوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ وہ اس نازک سے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ طالب علم کس سلوک کے مستحق ہیں اور ادب کی قدآور شخصیتوں مثلاً پروفیسر محی الدین قادری زور اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ کے ساتھ علمی مجادلے کے کیا تقاضے ہیں۔

تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بلکہ تحقیق اور متنی

تنقید کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کے مردِ میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی قول وعمل میں تضاد ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خداداد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ وہ دونوں محاذوں پر چاق وچوبند ہیں۔

ہر شعبۂ علم میں اصلاح اور ترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے تاکہ ہر زمانے میں اس میں تازگی اور توانائی برقرار رہے۔ یہ کام روایت پرستی کے بل پر نہیں، بلکہ روایت سازی کی قوت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ رشید حسن خاں کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب 'اُردو املا' اس کی روشن مثال ہے۔ اس کتاب میں اُردو املا سے متعلق انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد تک کے تمام مباحث کو سمیٹا ہے بلکہ سائنٹفک انداز میں طریقۂ املا میں مناسب اور موزوں اصلاحات اور تبدیلیوں کے ذریعے اس کو ایک نئی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے عبارت میں رموزِ اوقاف کے استعمال پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے جس کا اُردو میں خاطرخواہ رواج نہیں۔ اسی طرح املے کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ املا سے متعلق آپ رشید حسن خاں کی ہر بات کو من وعن قبول کرلیں۔ ان کی بعض تجاویز سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ دوسری طرف ایسے اسکالر بھی ہیں جنھوں نے 'اُردو املا' کی بنیاد پر املا کے مسائل پر کتابچے شائع کرڈالے حالاں کہ 'اُردو املا' جیسی ضخیم کتاب

کے بعد اگر ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس کتاب کی ایسی تلخیص تیار کی جاتی جس کے مطالعے سے اُردو کے اساتذہ اور طلبہ کو یہ آگاہی بہم پہنچائی جاتی کہ 'عبارت کیسے لکھیں'۔ یہ کام بھی بعد میں خود رشید حسن خاں ہی نے انجام دیا۔ بہرحال املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی خصوصی دل چسپی آگے چل کر بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ میرے نزدیک 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کی تاریخی تدوین املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی اسی دل چسپی کا ثمرہ ہے۔ اب آپ 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' میں رجب علی بیگ سرور اور میر امن دہلوی کو براہِ راست بولتے ہوئے سن سکتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے اس بات پر بھی بجا طور زور دیا ہے کہ تحقیق کی زبان صاف، سادہ اور دوٹوک ہونی چاہیے، ان کے نزدیک تحقیق، دلائل اور ثبوت کی بنیاد پر مروّجہ حقائق کے رد وقبول اور نئے حقائق کی دریافت کا عمل ہے۔ اس اعتبار سے عبارت آرائی، طول کلام، انشا پردازی، صفات اور مغلق الفاظ کا استعمال تحقیق کے لیے غیر مناسب ہی نہیں نقصان دہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اگرچہ ادبی تحقیق کا تعلق براہِ راست ادب سے ہے لیکن بجائے خود تحقیق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ویسی ہی لچھے دار زبان میں گفتگو کرے جو 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم'، 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' جیسی تخلیقات میں استعمال ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق کی زبان دستاویزی ہونی چاہیے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آخر دستاویزی زبان اپنے قاری کو گرفت میں کیسے لے۔ جان دار تحقیق میں جاسوسی ناول کا سا سسپنس ہوتا ہے، حقائق کی اندھی گپھا میں ٹٹول ٹٹول کر چلنے کا سا سسپنس۔ جو محقق یہ سسپنس پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے پھر دستاویزی زبان ہی راس آتی ہے۔

جیسا کہ میں جانتا ہوں، رشید حسن خاں بنیادی طور پر مدرسے کے فارغ التحصیل

ہیں۔ ان کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں پھر بھی ہندوستان کی بیشتر یونی ورسٹیوں میں وہ توسیعی خطبات دینے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالات کے ممتحن بنائے جاتے ہیں۔ بمبئی، جموں، حیدرآباد اور دہلی کی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں انھیں برابر دعوت دی جاتی ہے۔ ان کی جو قدر و منزلت ہندوستان میں ہے وہی پاکستان میں بھی ہے۔ وہاں بھی لوگ ان کے ادبی منصب اور مرتبے سے پوری طرح واقف ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسی پاکستان کی مقتدر شخصیتیں ان کی قدر دان اور مداح ہیں۔

جو شخص رشید حسن خاں سے ذاتی طور پر کبھی نہ ملا ہو، وہ ان کے کارناموں اور شہرت کو دیکھ کر یہی اندازہ لگائے گا کہ یہ صاحب یقیناً کوئی مردم بیزار قسم کی چیز ہوں گے جو بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے ہوں گے اور باہر کی دنیا سے انھیں کوئی دل چسپی نہ ہوگی۔ لیکن رشید حسن خاں کے بارے میں یہ درست نہیں۔ وہ بالکل نارمل انسان ہیں۔ وہ ایک طرف پرانی وضع داریوں اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں اور انتہائی سلیقے سے انھیں اپنی زندگی میں برتتے ہیں تو دوسری طرف ان کی زندگی کے مشاغل و معمولات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انھیں آج کے زمانے کا آدمی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات کم نہیں لیکن انھوں نے یہ فتوحات سماجی رشتوں کی قیمت پر حاصل نہیں کیں۔ انھوں نے اپنے اوقاتِ روز و شب کو پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے علمی کاموں، اپنے دوستوں اور عزیزوں اور مشاغل و تفریحات میں تقسیم کیا ہے۔ آپ سوال کرسکتے ہیں کہ پھر خاں صاحب نے تحقیقی کام کا اتنا انبار کیسے لگا دیا۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت روی اور وقت کے صحیح استعمال کے اصول پر قائم رہے ہیں۔ وہ اگر پٹھان ہیں تو اسی حد تک کہ غلط آدمی اور غلط

بات کے ساتھ کبھی مصالحت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں قابلِ رشک توازن اور اعتدال ہے۔ اپنے علمی مشاغل پر وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند ہی گھنٹے صرف کرتے ہیں اور اپنے اس معمول پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ لمبی لمبی قلانچیں بھرنے والے خرگوشوں کو جھاڑیوں میں سوتا چھوڑ کر اپنے اس استقلال کے بل پر وہ فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جارہے ہیں۔

خاں صاحب یعنی رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں لگ بھگ تیس پینتیس سال رہے۔ گوائر ہال کے عملے، ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ اور اساتذہ سب کے ساتھ خاں صاحب کے خوشگوار تعلقات تھے۔ یہ تمام لوگ خاں صاحب کے روزانہ کے معمولات سے بھی باخبر تھے اس لیے کہ ان معمولات میں کبھی سرِ مو فرق نہیں آتا تھا۔ اگر آپ کسی وقت بنا بتائے خاں صاحب سے ملنے گوائر ہال چلے گئے اور وہاں خاں صاحب کے کمرے پر تالا لگا ہوا پایا تو آس پاس کے لوگ بتادیں گے کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہوسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار ہی سے خاں صاحب کے بارے میں پوچھ لیں تو وہی بتا دے گا کہ خاں صاحب نکل چکے ہیں یا ابھی نہیں نکلے ہیں۔ خاں صاحب کے معمولات یہ ہوتے تھے کہ صبح ساڑھے سات بجے تک ڈائننگ ہال پہنچ جاتے۔ ڈائننگ ہال میں ان کی نشست مخصوص تھی ہمیشہ وہیں بیٹھتے۔ ناشتے سے فارغ ہوکر آٹھ بجے ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے پر واپس نہیں جاتے بلکہ سیدھے دہلی اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس کا رخ کرتے۔ یہاں بھی لان کی میز مخصوص تھی جہاں وہ ایک گھنٹہ بیٹھتے۔ کافی ہاؤس کے بیرے ان کے مزاج اور مذاق سے بخوبی واقف تھے۔ ان سے صرف مسکراہٹ کی زبان میں گفتگو ہوتی۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کافی ہاؤس کے بعد کی اگلی منزل شعبۂ اردو ہوا کرتا تھا، جہاں سے ایک بجے سے کچھ پہلے لنچ کے

لیے اٹھ جایا کرتے تھے اس دوران کبھی کبھی اگر میں مل گیا تو مجھے بھی لنچ کی دعوت دے کر ساتھ گوائر ہال لیتے گئے۔ گوائر ہال کے باہر ایک کارندہ میز بچھا کر بیٹھتا ہے جو گیسٹ ٹکٹ کاٹتا ہے۔ ہال کے ممبر یہاں پہلے پیسے دے کر اپنے مہمان کا ٹکٹ لیتے ہیں پھر مہمان کے ساتھ کھانے کے لیے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کارندہ بخوبی جانتا ہے کہ خاں صاحب کی اپنے مہمان کو کھانا کھلانے کی تہذیب کیا ہے۔ خاں صاحب اپنے مہمان کو لے کر سیدھے کھانے کی میز پر پہنچتے تھے۔ مہمان کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہورہی ہیں، کھانا بھی چل رہا ہے اور اسی دوران نہ جانے کب بحسن وخوبی گیسٹ ٹکٹ والا معاملہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ شام کو خاں صاحب کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں بھی اسی انداز سے رونق افروز ہوتے تھے۔ خاں صاحب اپنے زمانے میں ہاکی کے کھلاڑی تھے اس لیے دلی کے شیواجی اسٹیڈیم میں ہونے والے ہاکی کے میچ بھی وہ اتنی ہی پابندی سے دیکھتے تھے ادھر کچھ برسوں سے ان کا یہ شوق ختم ہوگیا ہے۔

مجھے جب کبھی خاں صاحب سے کوئی صلاح مشورہ کرنا ہوتا تو میں صبح ساڑھے سات بجے سے کچھ پہلے گوائر ہال پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے گوائر ہال پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سے کچھ اوپر ہوگئے۔ دیکھا تو خاں صاحب کے کمرے پر تالا پڑا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ڈائننگ ہال گئے ہیں، آٹھ بجے تک آجائیں گے۔ میں انتظار میں کمرے کے آگے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے آٹھ بجے، پھر آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوگئے لیکن خاں صاحب نہیں لوٹے۔ کچھ دیر اور انتظار کرکے ڈائننگ ہال کے سامنے پہنچا۔ بیرے سے پوچھا تو پتا چلا آٹھ بجے نکل چکے ناشتہ کرکے۔ دوڑ کر گیٹ پر آیا تو چوکیدار نے بتایا، خاں صاحب تو گئے باہر۔ اب میں دوڑتا بھاگتا اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں خاں صاحب مزے سے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ مجھے

دیکھتے ہی بولے، آؤ برادر۔ اسی کے ساتھ بیرے کو کافی کا اشارہ ہوا۔ میں نے کہا، خاں صاحب مجھے پانچ منٹ کی دیر ہوگئی تھی۔ آپ کے کمرے کے آگے ٹہلتا رہا کہ آپ ناشتے سے فارغ ہوکر ادھر آئیں گے اور آپ سیدھے نکل آئے۔ خاں صاحب نے کہا، جب آپ وقت مقررہ پر نہیں آئے تو میں سمجھا آج آپ گول ہوگئے، میں تو اپنے رستے ہولیا۔ ایک دو بار اور میرے ساتھ یہی ہوا۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ یہ طے ہوا کہ اگر میں آپ کے ناشتے پر جانے سے پہلے نہ پہنچ پاؤں تو سمجھ لیجیے لیٹ ہوگیا ہوں، اب ناشتے کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی اس لیے آپ ناشتے سے فارغ ہوکر اسکول آف اکنامکس جانے کے بجائے کمرے پر ہی واپس آئیں۔ اس پر خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر کسی روز سرے سے آپ آئے ہی نہیں تو میرا تو سارا معمول درہم برہم ہوجائے گا۔ میں نے یقین دلایا کہ ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمی میں بش شرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑے میں پوری آستین کی قمیض، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بش شرٹ یا قمیض ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے، ہاتھ پر ویسٹ اینڈ کمپنی کی گھڑی۔ خاں صاحب کے کمرے پر جایئے تو ان کی میز پر چمک دار سکوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوئی ملیں گی۔ پوچھنے پر پتا چلے گا کہ یہ بس کے لیے ہیں۔ خاں صاحب بس میں کنڈکٹر کو کبھی بڑا نوٹ نہیں دیتے، ہمیشہ پورے پورے پیسے دیے اور جلد سے جلد اس سے خلاصی حاصل کی۔ وہ کنڈکٹر کو نوٹ دے کر اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ یہ کہے کہ ٹھہریے باقی پیسے بعد میں دوں گا یا اگر دے تو پھٹے پرانے نوٹ پکڑا دے جس سے اس دن کے ساتھ ایک اور جھک جھک میں پڑنا پڑے گا۔

رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کی بے تکلفی ہے، ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں، اس لیے کس و ناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے اور مختصر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں سے گاہے گاہے جا کر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع میں شامل ہے۔ ان میں ایک تو غلام ربانی تاباں مرحوم تھے، ان کے علاوہ بیگم ممتاز مرزا اور مخمور سعیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوں کہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمایے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔ یہ موضوعات وہ ان نوجوانوں کو تجویز کرتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں نئے نئے وارد ہو رہے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی وہ رہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ جنھوں نے مدرسے کی تعلیم بھی حاصل کی ہے انھیں تو خاص طور پر وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب سے متعلق موضوعات پر ریسرچ کریں تو خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج کے زمانے کا ہر طالب علم اس طرح کے موضوعات پر تحقیق کرنے کا اہل نہیں۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں رشید حسن خاں کو روایت کا امین کہا تھا اور اس حیثیت سے انھیں روایت پرستوں سے ممتاز قرار دیا تھا۔ لہٰذا اپنی اب تک کی تمام گفتگو میں برابر یہی کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے ہاں روایت کے عرفان اور احترام کے ساتھ اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی ہے۔ یہ اجداد کی رہ نمائی میں اخلاف کو قیادت سونپنے کا عمل ہے۔ روایت کے عرفان اور احترام کے لیے عقل و ادراک کی ضرورت ہے اور اس کی توسیع اور بقا کے لیے قوتِ عمل اور جوش کی۔ یعنی یہ دیوانگی عقل کا وہ سودا ہے جسے میرؔ نے شعور سے جنوں کرنے کا نام دیا ہے

اور اس بات کو یوں بھی کہا ہے:

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو

یہی شعور جنوں اور روایت و جدت کا خوش گوار امتزاج ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ تاب ناک جوہر ہے۔

❁❁❁

آلِ احمد سرور

سرور صاحب نے باقر مہدی کے نام اپنے ایک خط میں البیر کامیو کا یہ قو
کیا ہے — ”فن میں سمجھوتہ نہیں ہوتا ہاں زندگی میں ہوتا ہے اور یہ برا نہیں“۔
قول کو نقل کرتے ہوئے سرور صاحب نے گویا اپنی کتابِ زندگی ہمارے سامنے کھ
رکھ دی ہے، جملے کے اس بین السطور کے ساتھ کہ فن کار کی فن کارانہ شخصیت اور ا
انسانی سرشت کو خلط ملط نہ کیا جائے۔ سرور صاحب کے بارے میں یہ بات بھی
ہیں اور ان کے انتقال کے بعد تو اسے پھر کتنی ہی بار دہرایا گیا ہے کہ سرور صاحہ
دانش ورانہ سطح اتنی بلند تھی کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کے شانہ بشانہ دکھائی
دیتا۔ اسی کے ساتھ یقیناً سرور صاحب میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں لیکن سرور صاحہ
انسانی کم زوریوں کا سلسلہ ان کی موت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ تاہم جو کچھ وہ علم و دانش
سطح پر ہمیں دے گئے ہیں وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے بشرطیکہ ہمارے
اس سے کسبِ فیض کی توفیق ہو۔ دلّی والوں میں یوں بھی ایک کہاوت ہے — ”ہ
یاری سے کام یار کے فعلوں سے کیا کام“ — لہٰذا اگر ہم ادب، فلسفہ، سماج، سیاست

اور تاریخ کے طالبِ علم ہیں اور ان علوم سے سچا سروکار رکھتے ہیں تو ہمارے لیے سرور صاحب کے قد سے اوپر نکل جانے کا راستہ بھی سرور صاحب ہی کے کاندھوں پر بیٹھ کر چلنے سے ملے گا۔ رہا سوال کسی کی کردارکشی کا تو یہ پالا دوسرا ہے۔ ایسا سوچنے والے اسی پالے میں کبڈی کھیلتے رہیں تو بہتر ہے۔ یوں بھی ایسے لوگوں کے لیے سرور صاحب کا آسیب پیرِ تسمہ پا کی طرح الٹا انھی کے کاندھوں پر سوار رہے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سرور صاحب ہمارے ادب کی ایک ایسی معتبر اور محترم شخصیت ہیں جنھیں یہ اعتبار اور احترام علم و دانش کے اُس ذوقِ جنوں کی بدولت حاصل ہوا ہے جس کے آگے مجنوں کی شہرتِ دیوانگی بھی بس قصہ کہانی ہے۔

دانش ور کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ وہ Nonconformist ہوتا ہے۔ Nonconformism کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھتا ہے جن کے ذریعے تازہ ہوائیں آتی اور جاتی رہتی ہیں، سوچنے کا سلسلہ بند نہیں ہوتا، ذہن اور مزاج کو کسی ایک مسلک پر قرار نہیں آتا۔ یہ ایک غیر جانب دارانہ رویہ ہے۔ دانش وری کی قلم رو میں کسی ایک نظریے کے ساتھ زندگی بھر کے لیے سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا، کم از کم اس نظریے کی جوں کی توں حالت میں تو بالکل نہیں۔ اس کے برعکس، جیسا کہ کامیو نے بھی کہا ہے، معاملات زندگی میں سمجھوتے کی گنجائش ہے اس لیے کہ یہاں ہم کسی نہ کسی طور جانب دار ہوتے ہیں۔ Nonconformism اور غیر جانب داری ہی سے بالآخر انحراف کا راستہ نکلتا ہے۔ انحراف ذہنی قوتوں کو زندہ، توانا اور فعال رکھتا ہے۔ انحراف میں چوں کہ عام روش سے ہٹ کر راستہ نکالنا پڑتا ہے اس لیے وہ ذوقِ جستجو کے لیے تازیانے کا کام کرتا ہے اور پھر یہی ذوقِ جستجو انسان پر دیدہ و دریافت کی حیرت زائیوں کے نئے نئے در باز کرتا رہتا ہے۔ کبھی طالب علمی کے زمانے میں اقبال کے

بارے میں سرور صاحب کا یہ جملہ کان میں پڑا تھا — "اسرار کائنات پر اقبال کی ج
آشنائے راز کی حیرت ہے" — حیرت آشنائی راز آشنائی سے پہلے کی منزل ہے۔
صاحب نے اپنی تحریروں میں افکار کے جو دیے روشن کیے ہیں ان میں حیرت آشنا
سامان تو خوب خوب موجود ہے، رہی راز آشنائی یہ اپنے اپنے حوصلے اور ہمہ
بات ہے۔

میرے پیش نظر اس وقت سرور صاحب کا وہ انٹرویو ہے جو خلیل الرحمٰن اعظمی
ان سے لیا تھا۔ سرور صاحب نے نثر میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن جہاں تک مَیں
ہوں، انھوں نے ایسی کوئی تحریر نہیں چھوڑی جو ان کی خود کلامی یا loud thinking'
دیتی ہو۔ ہاں ان کے ذہن میں اگر کوئی مونولاگ لکھنے کا خیال آیا ہوتا تو یہ کمی شاید
ہوسکتی تھی۔ ان کی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' کے عنوان میں اگرچہ بلا کی سروریت
لیکن اس کتاب کے متن میں بجائے خود ان کی ذہانت اور افکار کا وہ کوندا لپکتا نہیں دِ
دیتا جو مثلاً ان کی دوسری تحریروں میں پہاڑوں کی گھن گرج برسات کا سا سماں د
ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ اس کتاب میں انھوں نے مستقبل کے اپنے سوانح نگ
ایک معتبر ماخذ بہم پہنچانے کے خیال سے اپنی توجہ زیادہ تر بیان واقعہ پر مرکوز رکھی؛
کے لیے انھوں نے ذہانت کے آڑے ترچھے خطوط کھینچنے کے بجائے ایک راوی کا ر
نبھانے ہی پر بس کیا ہے، سیدھے سادے انداز میں۔ اسی لیے خلیل الرحمٰن اعظمی نے
ہی کے دن کے لیے شاید سرور صاحب سے loud thinking کی یہ برسات پہلے
کرا کے رکھ لی تھی، اس انٹرویو کے ذریعے جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ سرور صاحب
بارے میں آگے کی بات چیت زیادہ تر اسی انٹرویو کے سیاق میں ہوگی۔
"یار کی بات سے کام" والی جو بات ابتدا میں کہی گئی تھی اس کے مصداق خلـ

الرحمٰن اعظمی نے سرور صاحب سے پہلی ہی بات یہ کہی — "سرور صاحب میں اور میرے
جیسے بہت سے لوگ جنھیں آپ کی تحریروں میں دل چسپی رہی ہے، آپ کے بارے میں
... ایسی باتیں (جاننا چاہتے ہیں) جن سے آپ کے ذہنی اور فنی ارتقا کے سمجھنے میں مدد
ملے۔" — ہم جانتے ہیں سرور صاحب ایک بہت اچھے شاعر بھی ہیں اور انھوں نے اپنی
ادبی سرگرمیوں کا آغاز بھی شاعری ہی سے کیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ان کی توجہ تنقید کی طرف
زیادہ مبذول ہوتی گئی۔ سرور صاحب کی تنقید کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے اس
وقت سراہا جب ۱۹۳۶ء میں 'سہیل' کے سالنامے میں سرور صاحب کا ایک مضمون 'بال
جبریل' پر شائع ہوا۔ اس سلسلے میں سرور صاحب نے مولوی عبدالحق کے حوالے سے تنقید
کے بارے میں یہ کہا ہے:

> "اُردو تنقید میں عام طور پر ایک سُراپن ہے۔ پرانے نقاد زبان و
> محاورے سے آگے نہیں بڑھتے۔ جن لوگوں نے مغربی تنقید کا مطالعہ کیا
> ہے، وہ اپنی تہذیب اور اپنی روایت کا شعور نہیں رکھتے اس لیے مغربی
> تنقید کا کوئی مثبت اثر ہمارے ادب پر نہیں پڑ رہا ہے۔"

جہاں تک سرور صاحب کی شاعری کا تعلق ہے خود سرور صاحب کے قول کے
مطابق، انھوں نے شاعری ترک کر کے تنقید کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ شاعری برابر کرتے
رہے مگر انھیں اپنے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اور بھی نئے نئے راستوں کی تلاش
تھی اور ان کے بارے میں یہ بات تو طے ہے کہ انھوں نے کبھی بھی دبستانی تنقید کو اپنا
شعار نہیں بنایا اور ان کی اسی صفت نے انھیں اپنے عہد کے دوسرے نقادوں سے ممتاز
رکھا ہے۔ سرور صاحب کو ابتدا ہی سے انگریزی شاعری سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا چناں
چہ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ سرور صاحب سینٹ

جانس کالج، آگرہ کے طالب علم تھے۔ وہاں شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر ہیرس خود بھی انگریزی کے شاعر تھے۔ سرور صاحب نے اپنی انگریزی نظمیں انھیں دکھائیں۔ پروفیسر ہیرس نہ صرف یہ کہ سرور صاحب کی نظموں کی اصلاح کرتے بلکہ سرور صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ سرور صاحب نے انگریزی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس کا سبب خود سرور صاحب کی زبانی سنیے:

> ''اس زمانے میں ایک بات ایسی ہوئی جس کی وجہ سے انگریزی میں نظمیں لکھنے کا شوق ختم ہوگیا۔ ۱۹۳۳ء میں پہلی مرتبہ میں کشمیر گیا تھا اور وہاں کے قدرتی مناظر سے متاثر ہوکر میں نے انگریزی میں بعض نظمیں لکھی تھیں۔ یہ نظمیں میں نے ایک دن محمود حسین صاحب (استاد شعبۂ انگریزی) کو سنائیں تو انھوں نے کہا، 'ہاں آپ کی ایسی ہی کچھ exercisesمیں مسٹر ہیرس کے پاس دیکھ چکا ہوں۔' لفظ exercises سے میں سمجھ گیا کہ میں انگریزی میں کیسی ہی نظمیں لکھوں، ان کی حیثیت مشقیات سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ تخلیقی کام اپنی مادری زبان میں ہی کرنا چاہیے۔''

یہ سرور صاحب کا زمانۂ طالب علمی تھا اور اس دور میں یہ بصیرت کہ انگریزی پر خواہ کتنا ہی عبور حاصل ہوگیا ہو ''تخلیقی کام اپنی مادری زبان میں ہی کرنا چاہیے'' کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہندوستان کے لوگ آج سے نہیں انیسویں صدی سے انگریزی میں شاعری کرتے چلے آرہے ہیں اور آگے چل کر اس زبان میں فکشن اور دوسری چیزیں بھی خوب لکھی گئی ہیں۔ تو پھر سرور صاحب کی اس سوچ کی ہم کیا تعبیر کریں۔ معاملہ یہ ہے کہ اُردو کی تہذیبی بنیادیں اتنی مستحکم رہی ہیں کہ ادب تخلیق کرنے والے تو کیا ادب کے

قاری یہاں تک کہ ادب کا ذوق رکھنے والے ان پڑھ تک اُردو کے nuances میں شرابور ہوتے ہیں لہٰذا اُردو ان کی mother tongue ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ہی ان کی first tongue بھی ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری زبانوں کے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ بیشتر لوگوں کے ہاں اور خصوصاً اعلا تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاں ایسی مثالیں ہیں کہ mother tongueکے رہتے ہوئے بھی انگریزی کو ان کے ہاں first tongue کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے باوجود nuances کا مسئلہ کسی نہ کسی طور وہاں بھی رہتا ہے۔ چناں چہ انگریزی میں سرور صاحب کی 'مشقیات' کے تناظر میں انگریزی کی ہندوستانی شاعرہ بلبلِ بنگال سروجنی نائیڈو کی انگریزی شاعری کے سلسلے میں ان کی سوانح نگار پدمنی سین گپتا کا بیان بھی محلِ نظر ہونا چاہیے جو بالواسطہ طور پر ہمیں سرور صاحب کی دور بینی کا قائل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ پدمنی سین گپتا انگریزی نقاد ایڈمنڈ گوس کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''ایڈمنڈ گوس نے انھیں (سروجنی نائیڈو کو) مصنوعی انگریزیت سے باز رہنے کی جو تلقین کی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی۔ انگریزی زبان اور مغربی عروض پر مہارت حاصل کر لینے کے باوجود اب انھوں نے انگلستان اور اس کے مناظرِ فطرت کے بارے میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ یہ منظر ان کی ہندوستانی نگاہ کے لیے اجنبی تھے۔ گوس کا کہنا ہے کہ (اس سے قبل) جو شعر سروجنی نائیڈو نے مجھے دکھائے، وہ فارم کے اعتبار سے مکمل، قواعد کے اعتبار سے درست اور کیفیت کے اعتبار سے بھرپور تھے لیکن ان کی کم زوری یہ تھی کہ یہ انفرادیت سے بالکل عاری تھے۔ یہ اشعار احساسات اور تصورات کے اعتبار سے مغربی تھے اور ان کی

اساس شیلی اور ٹینی سن کے ادبی سرمایے پر تھی ۔۔ ان اشعار میں مسیحی تسلیم و رضا کی سی کیفیت بھی نہیں تھی۔ میں مایوسی کے ساتھ ان اشعار سے دست بردار ہوگیا... اس کے بعد گوس نے شاگرد کو نصیحت کی کہ وہ اپنی شاعری میں روبن یا اسکائی لارک جیسے پرندوں کے ذکر سے گریز کریں۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی شاعری میں اینگلو سیکسن جذبات اور اینگلو سیکسن فضا کی خلط ملط کا سلسلہ بند کریں اور اس کے بجائے ہندوستانی روح کو بروئے کار لائیں۔ انھیں چاہیے کہ دیسی جذبات کا گہرا اور مخلصانہ تجزیہ کریں۔ ہندوستان کے قدیم مذہب پر روشنی ڈالیں اور ان پُراسرار چیزوں کی جانب اشارے کریں جنھوں نے ایک ایسے وقت میں مشرق کی روح میں ہلچل مچا دی تھی جب کہ مغرب نے روح کے وجود کے بارے میں سوچنا تک شروع نہیں کیا تھا۔"

پدمنی سین گپتا کے اس طویل اقتباس کے ذریعے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ (نقاد ایڈمنڈ گوس کی رائے کے مطابق) ہندوستانی شاعرہ سروجنی نائیڈو کے انگریزی اظہار کے لیے اینگلو سیکسن فضا اسی قدر اجنبی تھی جس قدر اجنبی (خود آل احمد سرور کی رائے کے مطابق) کشمیر کی فضا کے لیے آل احمد سرور کا انگریزی اظہار جسے انھوں نے بالآخر "مشقیات" تسلیم کرتے ہوئے از خود رد کردیا۔ ورنہ عام رویہ اور سوچ تو یہی ہے کہ اگر آپ میں شعر کہنے کی بھرپور صلاحیت ہے اور آپ کو انگریزی زبان پر بھی پورا عبور حاصل ہے تو پھر بھلا انگریزی میں شاعری کرنا کسے برا لگتا ہے، سوائے آل احمد سرور کے۔

آل احمد سرور یقیناً ہمارے سب سے بڑے نقاد تھے اور اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوجانی چاہیے کہ آل احمد سرور شاعری چھوڑ کر تنقید کے میدان میں نہیں آئے

تھے۔ اول تو یہ کہ انھوں نے آخر دم تک شاعری کبھی چھوڑی ہی نہیں اور دوسرے نثر میں ان کا میدان محض ادبی تنقید کبھی بھی نہیں رہا۔ ہم جب انھیں دانش ور کہتے ہیں تو اس لیے کہ انھوں نے ادب کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی علوم اور مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے ادب میں کسی سیاسی موقف کو کبھی تسلیم نہیں کیا لیکن ان کے نزدیک سیاست ہی روحِ عصر کا دوسرا نام بھی تھا۔ وہ عام معنوں میں تو سیاست داں نہ تھے لیکن انھیں ایک پولی ٹیکل سائنٹسٹ ضرور کہا جاسکتا ہے۔ یہ سلسلہ افلاطون سے آج تک چلا آرہا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے سرور صاحب سے ایک دل چسپ سوال یہ بھی کیا تھا کہ آپ نے ٹی. ایس. ایلیٹ کی طرح جس پایے کی تنقید کی ہے، اسی پایے کی شاعری بھی کیوں نہیں کی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سرور صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایلیٹ کی تنقید خود اس کی شاعری کی پیداوار تھی۔ اس نے تنقید 'انگریزی ادب کو پرکھنے کے لیے نہیں کی تھی بلکہ انگریزی ادب کے قارئین میں اپنی شاعری کا نیا ذوق پیدا کرنے کے لیے کی تھی۔ سرور صاحب نے یہاں یہ بھی کہا کہ ایلیٹ کی طرح میری تنقید کا تعلق میری اپنی شاعری سے نہیں تھا بلکہ اُردو شاعری اور پورے ادب کے مسائل سے تھا۔ سرور صاحب کے پاس بعض لوگوں کے اس سوال کا بھی مدلل جواب ہے کہ انھوں نے کوئی مفصل اور جامع کتاب لکھ کر تنقید کے سرمائے میں کوئی وقیع اضافہ کیوں نہیں کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے ادبی مسائل کو سمجھنے، ادبی اور جمالیاتی قدروں کا احساس دلانے اور ادب کا معیار متعین کرنے میں کہاں مدد ملتی ہے۔ ابھی ٹی. ایس. ایلیٹ کا ذکر ہو چکا ہے۔ سرور صاحب کے قول کے مطابق 'خود ٹی. ایس. ایلیٹ کی بھی تنقید کے موضوع پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی'۔ ٹی. ایس. ایلیٹ کی عالمی شہرت اس کے باوجود مسلم ہے۔

سرور صاحب صحیح معنوں میں ایک عصری شخصیت تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایسے مسلک کا پابند کر کے نہیں رکھا جس کا رنگ کچھ عرصے بعد ماند پڑ جاتا ہے۔ انھیں اس معنی میں ایک حقیقی ترقی پسند کہا جا سکتا ہے کہ وہ سکوت اور انجماد کے بجائے حرکت اور تسلسل کے قائل تھے۔ اس حرکت اور تسلسل کے جس سے زندگی میں، فکر و خیال میں، دید و دانش میں برابر بالیدگی آتی رہتی ہے۔ سرور صاحب ایک کثیر المطالعہ انسان تھے اس لیے وہ بلا کے باخبر بھی تھے اور عمر کے آخری سانس تک قویٰ کے مضمحل ہو جانے کے باوجود ان کی اس باخبری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ سراپا ایک جاگتا ہوا ذہن تھے اور اس جاگتے ہوئے ذہن کو انھوں نے موت کی پہلی اور آخری نیند کو چھوڑ کر کوئی اور نیند کبھی نہیں سونے دیا۔ مطالعے سے اس درجہ افادے کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور ملے گی۔ وہ جو کچھ بھی پڑھتے تھے اس سے سب کچھ قطرہ قطرہ اس طرح نچوڑ لیا کرتے تھے جس طرح چلتی گاڑی کا فیول ٹینک پٹرول نچوڑ لیا کرتا ہے۔ یعنی ان کے ہاں مطالعے کا ایک مثبت اور productive مصرف تھا۔ ان کا ذہن محض پڑھی ہوئی کتابوں کی کھتونی نہیں تھا جو پٹرول بھرے ٹینکروں کی طرح مال گاڑی کی پیٹھ پر لدے بے مصرف ڈولتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں چلتے چلے جانے کی کوئی امکانی حد بھی متعین نہیں تھی۔ یہی ان کی اصل منزل تھی۔ میں یہاں سرور صاحب کے بارے میں ایک اور بات ان کے ایک بہت ہی سادہ سے شعر کے حوالے سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس شعر میں سرور صاحب نے انتہائی پرکاری کے ساتھ اپنی دانش ورانہ خلش کو جس کو ہندی میں شاید چنتن کے لفظ سے بہتر طور پر سمجھایا جا سکے، انتہائی سادہ سے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ شعر ہے:

دل وہ کافر کہ حقیقت نہ فسانہ مانگے
ہر زمانے میں کوئی اور زمانہ مانگے

اس شعر میں شاعر نے اپنے مفہوم کو جن خطوط پر بیان کیا ہے وہ ہیں: کافر دل، حقیقت، فسانہ، ہر زمانہ، کوئی اور زمانہ، اور مانگے۔ اس کے بعد دیکھیے تو شعر میں کوئی لفظ بچتا ہی نہیں۔ یہ چستیِ بندش کی وہ مثال ہے جہاں فیشن ایبل سماج میں تنگی لباس کی مدد سے بدن کی چستیِ بندش کا مظاہرہ کرنے کے برعکس گاؤں کی الھڑ دوشیزہ کے ڈھیلے ڈھالے لباس ہی سے ستار کے تاروں کی طرح کسے ہوئے اس کے بدن کا سنگیت پھوٹا پڑتا ہے۔ اب ذوقِ جمال کی اس فضا سے باہر آ کر ذرا شاعر کی دانش ورانہ خلش کی طرف آیئے۔ کافر دل، گویا انحراف پسند طبیعت ہے۔ حقیقت، ایک غیر معین یا اضافی تصور۔ فسانہ، وہ رومانی رویہ جس کی آغوش میں آپ جھولا ہی جھول سکتے ہیں اور بس۔ ہر زمانہ، دانش ورانہ فکر کا نئے سے نیا پڑاؤ۔ کوئی اور زمانہ، اس کی تشریح میں غالبؔ کا یہ شعر دیکھیے:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اور غالبؔ کے اس شعر میں سرور کے شعر کا 'مانگے' غالبؔ کے 'مجھ سے' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سرور صاحب نے باقر مہدی کے خط میں البیر کامیو کا قول نقل کر کے گویا اپنے دل کی بات کہی ہے۔ اس اعتبار سے اس بیان کے پہلے حصے میں سرور صاحب کا عرفان گونجتا سنائی دیتا ہے اور دوسرے میں اعتراف کی کانا پھوسی (whisper)، اور یہی بڑا انسان ہونے کی دلیل ہے۔ سرور صاحب کی طرف سے میرے دل پر بھی کچھ گھاؤ لگے تھے لیکن میری 'یاری' پھر بھی سرور صاحب کی فن کارانہ شخصیت سے ہے جو ہم سب کا مشترک اور قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ جہاں تک اس گھاؤ کا تعلق ہے، اس سے رستے ہوئے

لہو کو بھی میں نے رائگاں نہیں جانے دیا بلکہ اس سے رنگ کا کام لیتے ہوئے میں اپنے صفحۂ دل پر سرور صاحب کے گلستانِ دانش کے نقش اُتارنے میں کوشاں رہتا ہوں۔

پنڈت آنند نرائن ملاّ

ایک خیالی بات چیت اُن کی نگارشات کی روشنی میں

ملاّ صاحب کو میں ان کی شاعری اور سماجی شہرت کے تعلق سے ایک مدت سے جانتا ہوں۔ بیسیوں بار انہیں دیکھا ہے اور چار چھ بار ان سے ملنے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔ ایک بار ان سے اس وقت قدرے تفصیلی ملاقات کا موقع بھی ملا جب میں نے ان کے گھر پر اُردو گھر سے متعلق ریڈیو کے لیے ان کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ میری ایک کمزوری یہ رہی ہے کہ جہاں دو چار بڑے آدمی جمع ہوتے ہیں، میں بڑھ بڑھ کر ان کے درمیان گھسنے کے بجائے اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیتا ہوں اور ایسے موقعے پر کم گوئی نہیں بلکہ بے زبان بنا بیٹھا رہتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر بڑے لوگوں کے ساتھ کئی بار بیٹھنے کا موقع ملنے کے باوجود میں اپنے وجود کا کوئی نقش اُن پر نہیں چھوڑ پاتا۔ ایسا ہی کچھ میں ملاّ صاحب کے بارے میں سوچتا رہا ہوں یعنی یہ کہ میں تو ان سے بخوبی واقف ہوں لیکن شاید وہ مجھے نہیں جانتے۔ پچھلے دنوں جب ملاّ صاحب کو ایک حادثے کا شکار ہو کر ولنگڈن ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس خبر سے ان کے بہت سے چاہنے والوں کو تکلیف ہوئی۔ میں ملاّ صاحب کے معمولاتِ زندگی اور ان کی فعال شخصیت کے بارے میں بہت

کچھ جانتا تھا، خاص طور پر ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ اپنے انتہائی قریبی تعلقات کی وجہ سے۔ میرا ردِّ عمل اس حادثے پر جس کا ملّا صاحب شکار ہوئے تھے، کچھ مختلف تھا۔ یعنی یہ کہ وہ شخص جو اس صدی کا لگ بھگ ہم عمر ہے وہ نہ صرف یہ کہ الحمدللہ آج تک بقیدِ حیات ہے بلکہ اس کی زندگی میں حادثوں کے گزرنے کا سلسلہ بھی برابر جاری ہے۔ یہ بات میرے لیے اتنی قابلِ رشک تھی کہ اس حادثے کی خبر سن کر مجھے ملّا صاحب سے نہ تو کوئی ہمدردی ہوئی اور نہ ان پر رحم آیا۔ ہاں دل میں یہ خواہش ضرور جاگی کہ وہ جلد اچھے ہو جائیں۔ دراصل انتہائی مصروف زندگی گزارنے والے لوگ اپنے جسمانی نظام کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو بہت سے غریب اِکّے تانگے والے اپنے ٹٹو کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی انھیں اُس ٹٹو کو بس ہر وقت جوتنے سے کام رہتا ہے۔ لیکن جب کسی نہ کسی دن یہ بات اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ ٹٹو ان کے اِکّے تانگے کو لے کر پوری سواریوں کے ساتھ بیچ سڑک میں بیٹھ جاتا ہے اور باوجود بے شمار چابک کھانے کے اس وقت تک سڑک پر سے نہیں اٹھتا جب تک کہ وہ اپنی ماندگی کا وقفہ پورا نہ کر لے۔ کچھ ایسا ہی سلوک شاید ملّا صاحب نے بھی اپنی بے انتہا فعال شخصیت کے سبب اپنے جسمانی نظام کے ساتھ کر رکھا تھا، جس کے نتیجے میں ان کے اعضائے جسمانی نے اپنے واسطے کچھ عرصے کی لازمی چھٹی خود ہی حاصل کر لی اور اس بہانے خود ان کے اردگرد پھیلے ہوئے کام کو بھی ستانے کا موقع مل گیا — کام کرنے والے لوگ جب تھکن اتارنے کے بعد چھٹی سے واپس لوٹتے ہیں تو اتنے تازہ دم دکھائی دیتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ان کے کام کو پسینہ آنے لگتا ہے — خیر تو ملّا صاحب کے حادثے کی خبر سن کر میں ان کو بسترِ استراحت پر دیکھنے کے اشتیاق میں ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ ولنگڈن ہسپتال پہنچا۔ کمرے میں بڑا آدمی صرف ایک ہی تھا، وہ بھی لاچار سا بستر پر پڑا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح

قصباتی میلے کے چلتے پھرتے چڑیا گھر میں کوئی شیر کسی ڈبے میں بند دکھائی دیتا ہے۔ اس خلوت سے میری کچھ ہمت بڑھی اور کچھ ہی دیر میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہسپتال کے کمرے کے یہ لمحے ملّا صاحب کے ساتھ انتہائی قربت میں گزر رہے ہیں۔ ملّا صاحب بڑی دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے باتیں کرتے رہے۔ میں اور ڈاکٹر خلیق انجم ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہماری کمپنی سے کافی خوش دکھائی دیتے تھے اس لیے بھی کہ ہم نے ملّا صاحب کو بقول خود ان کے 'نگاہ ترحم سے شرمسار' نہیں کیا تھا۔

اِدھر انجمن میں جب ملّا صاحب کے جشن کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میرا جی چاہا کہ ملّا صاحب کے بارے میں، میں بھی کچھ لکھوں۔ ذہن پر لکھنے کے لیے زور ڈال رہا تھا لیکن کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک روز دماغ میں بجلی سی کوندی، کیوں نہ ملّا صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کچھ بات چیت ہی کی جائے، بالواسطہ ہی سہی۔ چناں چہ اس بالواسطہ ملاقات کا منصوبہ میں نے اس طرح بنایا کہ پہلے تو میں نے کچھ سوالات قائم کیے اور پھر ملّا صاحب کی شاعری کو اور کہیں کہیں ان کی شخصیت کو بھی سامنے رکھ کر ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے یا ترتیب دینے شروع کیے۔ آخر میں اچھا خاصا انٹرویو تیار ہو گیا جس کی خبر خود ملّا صاحب کو بھی نہیں۔ تصور کیجیے، ملّا صاحب میرے سامنے تشریف فرما ہیں۔ میں ان سے کچھ باتیں پوچھ رہا ہوں اور وہ میری باتوں کا جواب ایک ایک کر کے دے رہے ہیں۔ انٹرویو بالواسطہ لیا جائے یا بلا واسطہ، انٹرویو لینے والے کو اس بات کا موقع ہر وقت حاصل رہتا ہے کہ جب وہ اس انٹرویو کو قلم بند کرے تو کہیں کہیں اپنے الفاظ بھی اپنے مخاطب کے منہ میں ڈالتا چلے۔ اس لیے اس بات چیت سے ملّا صاحب کی جو تصویر بھی آپ کے ذہن میں بنے اسے کیمرے کی تصویر نہ سمجھیے، مصور کا نقش سمجھیے اور نقش کی قسمت میں 'شوخیِ تحریر کا فریادی' ہونا تو لکھا

ہی ہے۔

میں : ملاّ صاحب! کشمیری پنڈتوں کے وہ گھرانے جو خصوصاً دہلی اور یوپی میں آکر آباد ہوئے، انتہائی مہذب شائستہ اور اس ہندوستانی مغل تہذیب میں رچے بسے نظر آتے ہیں جس میں اُردو اور فارسی کا ستھرا مذاق بھی شامل ہے۔

ملاّ : دیکھیے اگر آپ زمانہ حال کی بات چھوڑ دیں تو آپ دیکھیں گے کہ کشمیر برصغیر کا وہ خطہ ہے جو کسی بھی قسم کے مذہبی تعصب سے بالاتر رہا ہے۔ کشمیر کے پنڈت اعلانیہ طور پر گوشت خور ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی بہت سی رسوم میں بھی گوشت کا استعمال ہوتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ جب کشمیر سے اتر کر نیچے آئے تو دہلی اور لکھنؤ کی جاگیرداری تہذیب کی وضع داریاں انھیں بہت بھائیں۔ چھپ کر گوشت نہ کھا سکنے والے کشمیری پنڈتوں نے اپنی زندگی میں ریاکاری کے خلا کو پُر کرنے کی لاشعوری کوشش میں جاگیرداری تہذیب کی ان خوب صورت اور مستحسن ریاکاریوں کو گلے لگایا جن میں اپنی عزت آبرو کا پاس، لباس کی تہذیب، گفتگو کا وقار، لب و لہجے کی شائستگی، مجلسی آداب، رواداری، نیک سلوک، سماجی پیچیدگیوں کی پوری سمجھ رکھنے کے باوجود نظریاتی الجھنوں سے خود کو بچائے رکھنے کا سلیقہ اور دانش ورانہ فکر، غرض یہ تمام چیزیں شامل تھیں۔ اس تہذیب کی حیثیت ہم کشمیری پنڈتوں کی نظر میں راستِ شرانگیز کے مقابلے میں دروغِ مصلحت آمیز کی تھی جس پر ہم پوری طرح ایمان لائے۔ اسی لیے دہلی اور یوپی کے اُردو بولنے اور گوشت کھانے والے مسلمانوں کو ہم کشمیری پنڈت اپنے سے زیادہ مسلمان اور کائستھوں کو اپنے سے زیادہ کائستھ نظر آتے ہیں۔

میں : پروفیسر آل احمد سرور نے 'جوئے شیر' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ آنند نرائن ملاّ کی شاعری نئے لکھنؤ کی آواز ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ملاّ : نئے لکھنؤ سے سرور صاحب کی کیا مراد ہے، اس کی وضاحت تو وہ اسی دیباچے میں آگے چل کر کرچکے ہیں لیکن میرے نزدیک نئے لکھنؤ کے کیا معنی ہیں، وہ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ ملحوظ رہے کہ اس بات کا جواب صرف اپنی ذات اور شاعری کے حوالے سے دے رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نئے لکھنؤ نے ناسخ کی اس مرصع زبان کی تقلید نہیں کی جس کی تقلید میں غالبؔ کہاں کے کہاں پہنچ گئے، یہاں غالبؔ کی عظمت زیرِ بحث نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ نئے لکھنؤ کی آواز میں آپ کو زبان اور شعری موضوعات دونوں کو شامل کرنا پڑے گا۔ یہ نیا لکھنؤ اس صاف اور واضح پیرایۂ اظہار میں یقین رکھتا ہے جس کی مقبولیت داغ اور ان کے شاگردوں کے سلسلے سے ہندوستان میں چاروں طرف عام ہوئی۔ چناں چہ شاید داغ ہی کے اثر سے اقبال جیسے عظیم شاعر کے ہاں بھی تمام تر بلندیٔ فکر اور فارسی الفاظ کی کثرت استعمال کے باوجود پیرایۂ اظہار صاف ہے۔ اب آپ اگر اپنی نخوتِ ابہام میں اس شاعری کو بیانیہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شعر کی تہ سے اُچھل کر کچھ آنا چاہیے اور بیانیہ میں یہ کام اور بھی مشکل یوں ہو جاتا ہے کہ وہاں شاعر قاری کے قیاس کا فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے پیٹ میں کچھ چھپا نہیں چھوڑتا۔ جہاں تک شعری موضوعات کا تعلق ہے، اسی لکھنؤ میں مجاز اور ملاّ دونوں طرح کے شاعر پیدا ہوئے۔ ایک ترقی پسندوں کی پالی کے اندر کا شاعر ہے اور دوسرا پالی کے باہر کا مگر پالی کے اندر کا شاعر ہو یا پالی کے باہر کا دونوں کا سماجی سیاق و سباق تو ایک ہی ہے۔ ایک سچے شاعر کے لیے سماجی سیاق و سباق سے جڑا رہنا پہلی شرط ہے اب اس سیاق و سباق کے ساتھ اپنی وابستگی کے اظہار کی کتنی سکت یا جرأت اس کے اندر ہے یہ اس سے آگے کی بات ہے۔

میں : آپ انسان دوست ہیں، انسانیت کے علم بردار ہیں۔ میں آپ سے یہ

جاننا چاہوں گا کہ انسان کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ملاّ: میں انسان کو مرکزِ کائنات سمجھتا ہوں۔ یہ نظامِ کائنات اپنی تمام تر ہیبت اور عظمت کے باوجود بے حس اور بے زبان ہے۔ انسان ہی نظامِ کائنات کی زبان بھی ہے اور حس بھی۔ اور جب میں آپ سے انسان کی بات کر رہا ہوں تو اس میں انسان کے تمام ہی متنوع اور متضاد روپ شامل ہیں، اس لیے میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں کسے سینے سے لگاؤں اور کسے مردود قرار دوں۔ اور جب تک مجھ پر کائنات کی اصل اور تمام تر حقیقت منکشف نہیں ہو جاتی، خدا جانے وہ دن کبھی آئے گا یا نہیں، میں کائنات کی اصل حقیقت انسان کو ہی سمجھتا رہوں گا۔ انسان کے سارے روپ میرے اپنے روپ ہیں۔ انسان کا ہر دین اور انسان کی لادینی میرا دین اور میری لادینی ہے۔

میں: گناہ کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

ملاّ: جو فرق وہم اور حقیقت میں ہے، وہی میرے نزدیک عبادت اور عصیاں میں ہے۔ عقیدہ گھپ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر، بچ بچا کر، نپے تلے قدموں کے ساتھ، بغیر کسی چیز سے ٹکرائے یا ٹھوکر کھائے آگے بڑھنے یا کسی سمت کے تعین کے احساس کے بغیر صرف ٹامک ٹوئیاں مارنے کا نام ہے جس میں شاید کہیں بہت دور تک اور بالکل سیدھے چلتے چلے جانے کا امکان کم ہی ہے۔۔ اس کے برعکس گناہ نام ہے ایک خود اعتمادی اور خود اختیاری کا۔ گناہ کے جہاں میں نصف النہار کا سا سماں ہوتا ہے جہاں ہر چیز روشن اور صاف ہوتی ہے۔ ایسے میں دانستہ ٹھوکر کھانے میں جو لطف آتا ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عقیدے کا دائرہ جتنا تنگ ہوتا ہے، گناہ کے حدود اربعہ اتنے ہی لامتناہی ہوتے ہیں۔ گناہ کی بارگاہ میں کوئی سجدہ نامقبول نہیں ہوتا ہے۔ جہاں جستجو گناہ ہو، گفتگو جرم ہو، جرأت پہ تعزیریں ہوں، اظہار پر پہرے ہوں، حسن پر مخرب اخلاق ہونے

کی فردِ جرم عائد ہو، جہاں میرے دوش پر خود میری خطا کے بار کے علاوہ اور کوئی بار نہ ہو، وہ فضا مجھے کائنات کی وسعتوں سے بھی زیادہ کھلی لگتی ہے، اس فضا میں میرا دیر تک سانس لینے کو جی چاہتا ہے، اجزائے عناصر کے پریشاں ہونے تک۔

میں: ملاّ صاحب آپ اپنی گفتگو میں خاصے رومانی ہوتے جا رہے ہیں۔

ملاّ: ہاں! شاید اسی لیے کہ شاعری میں نہیں ہو سکا۔ ہمیشہ صاف اور دوٹوک باتیں کرتا رہا جسے آپ کے زمانے کی بقراطی تنقید سپاٹ بھی کہہ سکتی ہے۔

میں: آپ کا تعلق نئے لکھنؤ سے ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پرانے لکھنؤ میں تو معاملہ بندی کی شاعری بہت ہوئی۔ آپ کے کلام کے مطالعے سے کہیں کہیں ایسا پتا چلتا ہے کہ طبیعت آپ کی بھی کافی رنگین رہی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی بعض طویل عشقیہ نظموں کی جانب ہے۔

ملاّ: دیکھیے پرانے لکھنؤ کی شاعری میں پنچایتی قسم کی معاملہ بندی کا رواج تھا۔ دلی میں مومن جیسے شاعروں کے ہاں انفرادی معاملات کا ذکر زیادہ نجی اور مہذب انداز میں ملتا ہے۔ جہاں تک میرے معاملاتِ عشق و عاشقی کا تعلق ہے ان میں نہ تو وہ بازاری پن ہے کہ مجھے یہ کہنا پڑے کہ:

کودا یوں ترے گھر میں کوئی دھم سے نہ ہوگا

اور نہ میرے ہاں جاگیرداری گھرانوں کے اس چوری چھپے عشق والا معاملہ ہے، جس کے بارے میں مجھے یہ خوف لاحق ہو کہ:

زندگی پردہ در نہ ہو جائے

یہ صحت مند اور بے ریا عشق کی وہ سیدھی سچی نظمیں ہیں جو طویل اس لیے ہیں تاکہ خوش ذائقہ یادوں کا چسکا میں دیر تک لے سکوں۔ ان نظموں کا معاملہ down-

memory lane کا سا ہے۔

میں : کیا آپ یہاں زندگی کی کسی حسین واردات کا ذکر کرنا پسند کریں گے؟

ملاّ : اب اس عمر میں ان وارداتوں کو دوہرانا ٹھنڈی کافی کے پیالے پر گرم گفتگو کرنے کے مترادف ہوگا۔

میں : آج کی نوجوان نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل گمراہ، بے راہ رو اور اپنی قدروں سے بے گانۂ محض ہے۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں؟

ملاّ : ہم جب تک قدروں کے خزانے پر سانپ بنے بیٹھے رہیں گے اور انھیں نئی نسل میں اس طرح تقسیم کریں گے جیسے کنجوس خیرات دیتا ہے تو پھر نتیجہ تو یہی ہونا ہے۔ آپ تو نئی نسل کی بات کر رہے ہیں، آپ نے یہ تماشا بھی تو دیکھا ہے کہ جب آپ نے شاعری کو قدامت کے جوئے کے نیچے سے نکلنے سے روکا تو کچھ دنوں کے لیے آپ کی شاعری تک ننگی ہوگئی اور یہ لنگ اس میں تھوڑی بہت اب بھی ہے۔ لیکن اس کے لیے ذمے دار کون ہے؟ چاہے شاعری ہو یا سماج جب تک آپ مستقبل کا کوئی لائحہ عمل تیار کر کے نہیں رکھیں گے تو نتیجہ افراتفری کے علاوہ اور کیا ہونا ہے۔

میں : آزاد ہندوستان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ملاّ : سماجی انصاف کی لڑائی حکومتیں بدلنے سے نہیں ختم ہوجاتی۔ اگر ایسا ہوسکتا تو کسی بھی ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس کے عدالتی نظام کو بھی تہ کر کے رکھ دیا جاتا۔ پیروں کی بیڑیاں ہر آدمی کاٹ کر پھینک دینا چاہتا ہے لیکن گردن کی طلائی زنجیر کوئی نکال کر پھینکنے کو تیار نہیں۔ اور پھر ایک آزاد ملک میں انسان کو روٹی کپڑا مکان ہی نہیں اپنی تہذیب، اپنی زبان بھی تو چاہیے ہوتی ہے۔ روٹی کپڑے مکان کی ضمانت ہر ہندوستانی کو آج آزادی ملنے کے تقریباً نصف صدی کے بعد بھی حاصل نہیں ہوسکی لیکن زبان اور

تہذیب پر تو آزاد ہوتے ہی راتوں رات ڈاکا پڑ گیا۔

میں : بس آخر میں ایک سوال اور دریافت کرنا ہے۔ ہماری شاعری میں نظیر اکبر آبادی اور پھر ان کے بعد انجمن پنجاب سے لے کر آج تک نظم کی ایک توانا روایت موجود تھی پھر بھلا آپ غزل کو شبستاں سے میدان میں کیوں کھینچ لائے؟

ملاّ : آپ جانتے ہیں، میں نے نظمیں بھی کافی کہی ہیں پھر بھی اتنی نہیں جتنی غزلیں کہیں ہیں۔ دراصل آپ خود ہی کہہ چکے ہیں، میری تمام تر غیر رسمی اور غیر روایتی فکر کے باوجود میری شخصیت کی اصل شناخت میری جاگیردارانہ شائستگی ہے۔ آپ اس جاگیردارانہ شائستگی کو ایک مستحسن تہذیبی ریاکاری کا نام دیتے ہیں اور آپ کی اسی بات سے مجھے آپ کی بات کا جواب تلاش کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ غزل بڑی ریاکار صنف ہے۔ کہنا کچھ چاہتی ہے کہتی کچھ ہے۔ اب آپ ہی بتائیے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی غلامی کی اس آزاد دنیا میں اگر ملاّ غزل کی ریاکاری کے پردے میں اپنی بات نہ کہتا تو کیا لوگ اسے زندہ چھوڑتے۔ دراصل میں نے اکثر غیر متنازع باتیں نظم میں اور بیشتر متنازع باتیں غزل کی زبان میں بیان کی ہیں۔ جو شخص پیشے کے اعتبار سے حاکم وقت کا وکیل ہو، اس کے اندر کا شاعر تو غزل کی یہی زبان استعمال کرسکتا ہے نا:

وہ داد و ستدِ دل نہ وہ بزم نہ وہ رند
انساں کی جگہ آج ہے وردی میں سپاہی

ملاّ صاحب کے ساتھ اس طویل گفتگو کا ایک مقصد ان سے ذہنی قربت حاصل کرنا بھی تھا جو میری حد تک تو پورا ہو ہی گیا ہے۔

❁❁❁

گلزار دہلوی

سوانحی کوائف

گلزار دہلوی کا پورا نام پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی ہے۔ ان کے اجداد شاہجہاں کے عہد میں کشمیر سے دہلی آئے، جہاں وہ مغل شہنشاہ کے دربار میں شہزادوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ یہ لوگ سنسکرت، عربی، فارسی اور ہندوستانی (اُردو) کے ماہر تھے اوران کے علمی وقار کو بجا طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

گلزار صاحب کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی، دہلی میں نواب مرزا داغؔ دہلوی کے جانشینوں میں سے ایک تھے۔ اس سلسلے کے دو اور اہم نام نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور وحید العصر استاد وحید االدین بیخودؔ دہلوی تھے۔ نواب سائل کا تعلق خاندان لوہارو سے تھا اور بیخود صاحب دلّی کے روڑے تھے۔

گلزار صاحب کی والدہ محترمہ برج رانی زتشی (المعروف بہ وکٹوریہ زتشی) بیزار دہلوی تھیں۔ انھیں نواب سائل سے تلمذ حاصل تھا۔

گلزار صاحب کے غالباً دو بڑے بھائی تھے، ایک پنڈت دینا ناتھ زتشی جو آل

انڈیا ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھے اور دوسرے رتن موہن ناتھ خارؔ دہلوی جو شاعری میں نواب سائل کے شاگرد تھے اور پیشے کے اعتبار سے کلاس ون گزیٹڈ آفیسر تھے۔

گلزار صاحب کی تاریخ ولادت ۱۳رجولائی ۱۹۲۶ء ہے۔ ان کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ دہلی یونی ورسٹی سے ایم.اے، ایل.ایل.بی کا امتحان پاس کیا اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور پنڈت کیفی کی قیادت میں چلنے والے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اُردو کالج سے اُردو میں ادیب فاضل اور فارسی میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ بحیثیت ایک ادیب اور شاعر انھیں نواب سائلؔ، جانشینِ داغؔ اور پنڈت کیفی دتاتریہ، یادگارِ حالی سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔

گلزار صاحب کے بیان کے مطابق، انھوں نے اولاً کچھ دن اُردو لکچرر کی خدمات انجام دیں، اس کے بعد دہلی کلاتھ اور جنرل ملز کے مالک لالہ شنکر لال کے مشیر کی حیثیت سے آرٹ، زبان اور کلچر سے متعلق امور کو دیکھتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں گلزار صاحب نے تاسیسی اڈیٹر کی حیثیت سے CSIR کے سرکاری رسالے ماہنامہ 'سائنس کی دنیا' کے اڈیٹر کا عہدہ سنبھالا اور ۱۹۹۰ء تک اس منصب پر بہ حسن وخوبی فائز رہے۔ انور جمال قدوائی، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زمانے میں گلزار صاحب کو جامعہ کی جانب سے سائنسی صحافت کو مقبولِ عام بنانے کے سلسلے میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل ہوئی جس کے بعد وہ ڈاکٹر آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کہلائے جانے لگے۔

گلزار صاحب یورپ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، وسط ایشیا، روس، عرب، امریکہ وغیرہ دنیا کے پچاس سے زیادہ ممالک کا دورہ کر چکے ہیں جہاں بحیثیت ایک شاعر اور شیدائے اُردو کے ان کی بے پناہ پذیرائی ہوئی اور انھیں بے شمار انعامات واعزازات اور خطابات سے نوازا گیا ہے۔

گلزار صاحب نے اپنی زندگی میں جو ادارے اور انجمنیں قائم کیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ۱۹۴۰ء، اسمارٹ ینگز ایسوسی ایشن جو دسہرے کے دنوں میں رام لیلا میدان میں ہونے والی پوری رام لیلا کا نظم و نسق سنبھالتی ہے۔ گلی کشمیریان میں واقع ان کے آبائی مکان سے گلزار صاحب کی کارکردگی کا یہ میدان سب سے قریب ہے۔

۲۔ ۱۹۴۶ء، ادارہ نظامیہ، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا

۳۔ ۱۹۴۷ء، انجمن تعمیر اُردو

۴۔ ۱۹۷۱ء، نیشنل رائٹرز ایسوسی ایشن

۵۔ ۱۹۸۴ء، ڈاکٹر سیف الدین میموریل کونسل

۶۔ ۱۹۸۹ء، آل پارٹی سنٹرل یوتھ اُردو کونسل زیر سرپرستی سابق صدر جمہوریہ ہند، آر وینکٹ رمن

گلزار دہلوی کو جن بے شمار انعامات سے نوازا گیا ہے ان میں خاص خاص یہ ہیں:

☆ غالب ایوارڈ برائے شاعری، غالب انسٹی ٹیوٹ

☆ اقبال ایوارڈ، لاہور یونی ورسٹی، پاکستان

☆ مصحفی ایوارڈ، انجمن سادات امروہہ، کراچی، پاکستان

☆ اختر شیرانی ایوارڈ، اسلام آباد، پاکستان

☆ نشان پاکستان ایوارڈ، اسلام آباد، پاکستان

☆ عاشق رسول ایوارڈ، دارالعلوم دیوبند بہ دست شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

گلزار مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ یہ تہذیب ان کی رگ رگ میں پیوست اور ان کے لہو کی بوند بوند میں گھلی ملی ہوئی ہے۔ مشترکہ تہذیب کے مفہوم میں سیکولرزم، قومی اتحاد اور انسان دوستی یہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ ان کی شخصیت کا بھی وہ جوہر ہے جس کے سبب بیسویں صدی کی تمام تاریخی ہستیوں کا قرب انھیں حاصل رہا ہے۔ ان شخصیتوں میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، شیخ عبداللہ، پروفیسر ہمایوں کبیر، خان عبدالغفار خاں، اندرا گاندھی، بابو جگجیون رام، اوما شنکر دکشت، بھیم سین سچر، موہن لال سکھاڈیا، پروفیسر نورالحسن اور پروفیسر سروپ سنگھ جیسی ہستیوں کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

شخصیت

گلزار دہلوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء میں جمنا کے کنارے لوہے کے پل کے نیچے دھوبی گھاٹ کے پاس پیراکی کے استاد خلیفہ یعقوب پہاڑی بھوجلہ والے کے ٹھیے پر ہوئی جہاں روزانہ صبح اور شام تیراکی کی تعلیم کا سلسلہ چلتا تھا۔ میں اس وقت ابھی ٹھیک سے نوعمری کی منزل میں بھی نہیں آیا تھا اور گلزار تقریباً اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے گویا اگر گلزار کی موجودہ بیاسی سال کی عمر میں سے اٹھارہ سال منہا کر دیے جائیں تو ہماری رفاقتوں کا سلسلہ چونسٹھ سال پرانا ہے۔ گلزار کا رنگ اس وقت بھی اتنا ہی گورا چٹا تھا، آواز میں ویسا ہی کرارہ پن تھا، ذرا فاصلے سے کسی کو خطاب کریں تو ایسی بلند آواز کے ساتھ کہ آس پاس سب کو سنائی دے۔ وہ گلی کشمیریان، بازار سیتا رام سے سائیکل پر سوار ہو کر تیراکی کی مشق کے لیے جمنا آتے تھے لیکن شیروانی اور چوڑی مہری کا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہونا اور چوڑی مہری کا پاجامہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ یہ ان کا غیر رسمی لباس یا اسپورٹس ڈریس ہے۔ گویا شیروانی کی پاسداری ان

کے لیے کسی نہ کسی صورت یہاں بھی ضروری تھی۔ رسمی لباس میں چوڑی دار پاجامے کے ساتھ شیروانی کے بٹن گلے تک بند ہوتے تھے اور اس حالت میں ان کی آواز گلے سے اور زیادہ تیکھی ہو کر نکلتی تھی جو جلسوں میں تقریریں کرنے، مشاعروں میں کلام سنانے اور ادبی جلسوں کی نظامت کرنے جیسے مواقع پر بڑی موثر ثابت ہوتی تھی اور یہ صورت حال الحمدللہ آج تک جوں کی توں برقرار ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر وہ قدرے اور بس قدرے ہی اونچا سننے لگے ہیں، چلیے اونچا ہی سہی اب سننے تو لگے ہیں۔ اب تک تو وہ صرف بولتے ہی ہوتے تھے، سنتے کسی کی نہیں تھے۔

مجلسیں صرف ادبی ہی نہیں ہوتیں، انسانی سماج میں خاص طور پر گنجان آبادی والے شہر کے گلی محلوں میں جہاں اپنے اپنے مزاج، پیشوں اور ماحول کے اعتبار سے طرح طرح کی تنوع رہتی ہے، وہاں مجلسیں بھی طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ کمیونی لونگ کی حس رکھتے ہیں، جس کے اکتساب کے مواقع سینکچری جیسے کسی ایسے کیمپس میں میسر نہیں جہاں بس ایک ہی برانڈ کی تنوع بستی ہے تو پھر آپ طرح طرح کی مجلسوں میں رس بس جانا بھی جانتے ہیں اور ان کا لطف اٹھانے کی توفیق بھی آپ کو عطا ہو جاتی ہے۔

تو اگر گلزار کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ایک مجلسی شخصیت کے مالک ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ہر مجلس کے آدمی ہیں اور اپنے آپ کو منوانے کی قوت کے بل پر بیشتر مجالس کی جانِ مجلس بھی وہی رہے ہیں اور اب تک ہیں۔ گلی کشمیریان سے نکل کر کوچہ پاتی رام سے ہوتے ہوئے حوض قاضی کے چوراہے تک وہ طرح طرح کے مجلسی رنگوں سے معانقہ کرتے ہوئے چاوڑی بازار کے راستے بڑ شاہ بولا اور نئی سڑک کے تراہے پر کچھ لمحوں کے لیے اٹکتے ہوئے منشی شیش چند سکینہ طالب دہلوی کی گلی بتاشان کی حویلی کو پشت پر چھوڑتے جب وہ جامع مسجد کا رخ کرتے ہیں تو ایک مختصر وقفہ کبھی

کبھی کوچہ میر عاشق کے سامنے بھی آتا ہے جس کے اندر حاجی علی جان کی حویلی ہے۔ جہاں اس بات کا امکان رہتا ہے کہ کوچہ میر عاشق کے نکڑ پر شاید کسی شناسا سے پل دو پل کا آمنا سامنا اور علیک سلیک ہو جائے۔ جامع مسجد کا چوک شروع ہوا تو بائیں ہاتھ پر میرٹھ کے سیخ کباب والوں کی دکان آتی ہے جہاں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ یا بھائی ظہیر کے چائے خانے فرینڈز ہوٹل المعروف بہ چنڈو خانہ سے گلزار صاحب کے سنکے ہوئے جلے ہوئے سیخ کبابوں کا آرڈر میرٹھ کے کبابی کے ہاں پہنچتا رہتا ہے۔ لیجیے کتب خانہ عزیزیہ آگیا جہاں ادبی مجلس کا وہ بازار گرم رہتا ہے جس کے آگے کتب فروشی کا بازار ٹھنڈا پڑا رہتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو گیا اور اس کا فوری نتیجہ دلّی میں انتہائی بھیانک قسم کے فرقہ وارانہ فسادوں کی شکل میں ظاہر ہوا تو مہینوں تک دلّی کے گلی کوچوں میں مارشل لا کی آندھیاں سنسناتی رہیں۔ بہت سے بے گناہ جو مخالف فرقے کی تیر تلوار کا نشانہ نہیں بنے تھے انھیں کرفیو پولیس کی گولیاں لے اڑیں۔ گھر سے نکلنے کی مجال نہیں تھی۔ ایسے میں جب پولیس پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا تو کانگریس پارٹی نے ہندو مسلمانوں پر مشتمل شہریوں کی ایک بندوق بردار اسپیشل پولیس فورس کھڑی کی جس نے لوگوں کا خوف دور کرنے اور ان میں حوصلہ بحال کرنے کے لیے گلی محلوں کا دورہ شروع کیا، ان کی پریشانیاں سنیں اور فرقہ واریت کے جنون کو مندمل کرنے کی کوشش کی۔ اسپیشل پولیس کا ایک دستہ جب پہاڑی بھوجلہ، بلبلی خانہ اور محلہ قبرستان کا دورہ کرتا ہوا لوگوں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اس دستے کی کمان جناب گلزار دہلوی سنبھالے ہوئے تھے۔ ان محلوں میں خلیفہ یعقوب کی پیرا کی تعلیم کے بہت سے پیر بھائی رہتے تھے، ان میں سے گلزار صاحب نے ایک ایک کے گھر جا کر ان کی خیریت پوچھی۔ تو گلزار کی مجلسی زندگی کا

ایک روپ یہ بھی تھا۔

۱۹۵۶ء میں جب میں نے اور خلیق انجم نے علی گڑھ سے بی.اے پاس کر کے آنے کے بعد دلّی کالج میں ایم.اے اُردو میں داخلہ لیا تو اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ادبی محفلوں کا بھی چسکا پڑنا شروع ہوگیا یہاں تک کہ میں شعر بھی کہنے لگا، اگرچہ یہ سلسلہ اسکول کے زمانے ہی سے کچھ کچھ شروع ہو چکا تھا۔ اُردو بازار میں کوئی مشاعرہ تھا، سردار جعفری اس کی صدارت کر رہے تھے، ہم سامعین کی صف میں اسٹیج کے قریب ہی بیٹھے تھے، گلزار مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ میں تو ٹھہرا دو قسم کا انسان، خلیق انجم نے یہ شرارت کی کہ میرا نام ایک پرچی پر لکھ کر کھڑے ہوکر اسٹیج کی طرف یہ پرچی گلزار صاحب کو بڑھا دی۔ گلزار کی عقابی آنکھوں نے فوراً ہم دونوں کو تاڑ لیا اور کچھ ہی دیر میں مجھے اسٹیج پر آکر غزل پیش کرنے کی دعوت دے دی گئی۔ گلزار مشاعروں میں شاعروں کا تعارف بڑی تفصیل سے کراتے تھے چنانچہ میرے تعارف میں 'دلّی کے ہونہار نوجوان، دلّی کالج میں ایم.اے اُردو کے طالب علم' جو اس زمانے میں بہت بڑی چیز سمجھی جاتی تھی اس لیے کہ ظلِ ہمائے پی ایچ.ڈی اس وقت تک لوگوں کے سروں پر منڈلانا شروع نہیں ہوا تھا، یہ سب کہا گیا۔ کچھ تو گلزار کا باندھا ہوا سماں، کچھ غزل بھی غنیمت تھی، خاصی پذیرائی ہوئی۔ غرض اس طرح کے دو چار مواقع اور ایسے آئے جن کے بعد گلزار کو بہ خوبی اندازہ ہوگیا کہ یہ یعنی اسلم اور خلیق سڑک چھاپ قسم کے ادیب اور شاعر نہیں ہیں بلکہ نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نوجوان ہیں۔

اسی کے ساتھ شروع ہوتا ہے زمانہ انجمن تعمیرِ اُردو کی سرگرمیوں کے شباب کا۔ انجمن تعمیرِ اُردو کی ایک خصوصی نشست ۱۹۵۸ء کے اوائل میں کٹرہ نظام الملک، اُردو بازار کے اس مکان میں منعقد ہوئی جس میں مجاہدِ آزادی حافظ علی بہادر خان کے اخبار کا دفتر

اور خود حافظ صاحب کا قیام تھا۔ اس کے بعد تو پھر انجمن تعمیرِ اُردو کی ہفت روزہ تنقیدی نشستیں ہر اتوار کو اور ایک طرحی مشاعرہ مہینے کے آخری اتوار کو انتہائی پابندی کے ساتھ مہر علی تعلیمی مرکز، اردونا ہال، اُردو بازار میں اس بالا خانے پر ہونے لگا جو عرفِ عام میں میر مشتاق احمد صاحب کا کمرہ کہلاتا تھا۔ یہ نشستیں انتہائی پابندی سے سترہ اٹھارہ سال اس وقت تک چلتی رہیں جب تک کہ جامع مسجد کے اطراف میں جگ موہن جی کا وہ بل ڈوزر نہیں پھر گیا جس نے نہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کلچر کا صفایا کر دیا بلکہ پورے اُردو بازار کی ادبی فضا کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس خلفشار سے پہلے انجمن تعمیرِ اُردو کی نشستیں اُردو بازار میں وہ رنگ جما گئیں جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ گلزار صاحب کے دم کی بدولت انجمن کی ان نشستوں میں ادب کی تقریباً ہر محترم اور معتبر شخصیت نے اپنی شمولیت سے ان محفلوں کے وقار کو بڑھایا۔ علامہ زارؔ دہلوی، طالبؔ دہلوی، حافظ علی بہادر خاں صاحب، منشی گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی، علامہ انور صابری اور منشی عبدالقدیر جیسی برگزیدہ شخصیتیں پابندی سے ان نشستوں میں حاضر رہتیں اور ہم جیسے ان نوجوانوں کا حوصلہ بڑھاتیں جو تنقیدی نشستوں میں اپنی شعری اور نثری تخلیقات پیش کرتے تھے۔ گلزار کے دم کی بدولت انجمن تعمیرِ اُردو کی ان نشستوں میں اُردو کی جن قدآور شخصیتوں نے شرکت کی اور بعض نے اس کے ادبی پروگراموں میں حصہ بھی لیا ان کی ایک طویل فہرست ہے، بہرحال کچھ نام جو اس وقت حافظے میں محفوظ ہیں، یہ ہیں — جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، بنّے بھائی سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین، سید مسعود حسین رضوی ادیب، ماہر القادری، خواجہ محمد شفیع، سلام مچھلی شہری، آلِ احمد سرور، سید احتشام حسین، عصمت چغتائی، بیگم صالحہ عابد حسین، علامہ انور صابری، بسمل سعیدی، عمیق حنفی، گوپال متل اور اسی مرتبے کی اور کتنی ہی شخصیتیں۔ ۱۹۷۵ء کے بعد دلّی میں

وارد ہونے والے ادیبوں کو چھوڑ کر وہ تمام نوجوان ادیب اور شاعر جو مختلف مسالکِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، انجمن تعمیر اُردو کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ ادبی تربیت، نکتہ سنجی، نکتہ شناسی اور سخن سنجی اور سخن فہمی کا جو سامان ان نشستوں نے مہیا کیا، اس سے ہماری نسل کے کتنے ہی نوجوانوں نے فیض اٹھایا۔ آج بھی گلزار صاحب کی انجمن تعمیر اُردو تو زندہ ہے لیکن اس کا شیرازہ بالکل اسی طرح بکھر چکا ہے جس طرح شہر دہلی کے جغرافیے اور اس کی تہذیب کا۔ اس کے بعد نوجوانوں کی ادبی تربیت کا ایسا کوئی دوسرا مرکز دلّی میں دکھائی نہیں دیتا۔

گلزار ہمیشہ سے ایک ایسے کٹر کانگریسی رہے ہیں جیسے آج کل کے بنیاد پرست ہندو، مسلمان اور سکھ ہیں۔ لیکن اس کٹر پن میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک راہِ اجتہاد کی نکال رکھی تھی۔ پنڈت نہرو کے وہ عاشق، مولانا آزاد کے وہ شیدائی لیکن زندگی کے دو معاملات ایسے تھے جہاں ان کی کانگریسیت بھی انھیں ٹس سے مس نہ کر سکی، اس میں ایک اُردو کی بقا کا اور دوسرا مسلم اقلیت کے تحفظ کا معاملہ تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گلزار کو آپ اندر سے کتنا ہی کھرچتے چلیے، چاہے کسوٹی پر کسے ہوئے سونے کی طرح، اس میں سے صرف سونے کا بُرادہ ہی جھڑے گا۔ یہاں گلزار کے چند قطعے سنتے چلیے:

مضموں ہیں گہر فکر جواں ہے میری
کوثر میں ڈھلی طرزِ بیاں ہے میری
دلّی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اُردو جسے کہتے ہیں زباں ہے میری

☆☆☆

گیتا کی نہ توریت و گرو صاحب کی
انجیل نہ قرآں کی زباں ہے اُردو
مذہب کی نہ صوبوں کی نہ فرقوں کی فقط
واللہ کہ ہر دل کی زباں ہے اُردو

☆☆☆

تاریخ وطن حسن وفا ہے اُردو
ہر ذرے پہ بھارت کے فدا ہے اُردو
آزادی کی تحریک پہ ڈالو تو نظر
کھل جائے گا یہ راز کہ کیا ہے اُردو

☆☆☆

اس دیس کی سب ہم کو زبانیں پیاری
پیارے ہمیں ہر دیس کے علم و فن ہیں
تاریخ یہ کہتی ہے وطن کی لیکن
اُردو کے جو دشمن ہیں وطن دشمن ہیں

☆☆☆

دنیا میں تو اونچا ہے کلامِ اُردو
عقبیٰ میں بھی اونچا رہے نامِ اُردو
جب حشر میں ہو نام شماری آقا
منظور کہ کہلاؤں غلامِ اُردو

☆☆☆

آئین تو ہم روز بدل سکتے ہیں
اخلاق میں ترمیم نہیں ہوسکتی
ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں
تہذیب کی تقسیم نہیں ہوسکتی

☆☆☆

میں وہ ہندو ہوں کہ نازاں ہیں مسلماں جس پر
دل میں کعبہ ہے مرے دل ہے صنم خانوں میں
جوشؔ کا قول ہے اور اپنا عقیدہ گلزارؔ
'ہم سا کافر نہ اٹھا کوئی مسلمانوں میں'

آپ اسے گلزار کی کمزوری کہیے یا گلزار کی خصوصیت، گلزار کسی بھی موضوع یا کسی بھی شخصیت کے بارے میں کچھ گفتگو کریں یا کچھ بھی لکھیں، وہ سارا مکالمہ خود گلزار کی ذات کے گرد ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ اسے گلزار کا اسلوبِ تحریر و تقریر بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل گلزار ایک مخصوص تہذیبی بُنت کا وہ دھاگا ہیں جہاں ہر دوسرا دھاگا گلزار کے اس دھاگے کے ساتھ اور گلزار نام کا یہ دھاگا اس دھاگے کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے گلزار کی کسی بھی تحریر کو پڑھتے ہوئے اس تحریر پر چھائے گلزار کے پیچھے اگر آپ جھانک کر دیکھیں، بشرطیکہ آپ دیکھ سکیں تو آپ اس پورے تہذیبی نظام کی سیر کرسکیں گے، گلزار دہلوی جس کے پروردہ ہیں۔ اس شمارے میں شامل پنڈت کیفی پر گلزار کا مضمون گلزار کی اسی ادا کی ایک جھلک ہے۔

گلزار کی یادداشت قابلِ رشک ہے۔ چناں چہ گلزار کی گفتگو اور تحریر میں جن بے شمار اور اپنے دور کی تاریخی شخصیتوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کی یاد دلانے

والی اب روئے زمین پر بس ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی ہے جس کا نام ہے پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نظامی۔

''تم سلامت رہو ہزار برس''

پروفیسر رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی صاحب سے پہلی مرتبہ مجھے اس وقت نیاز حاصل ہوا جب اگست ۱۹۵۰ء میں، میں نے اور ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک ساتھ علی گڑھ یونی ورسٹی میں انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ ہم دونوں اس وقت نئے نئے علی گڑھ آئے تھے اور دستور کے مطابق فرسٹ ایرفول کی کیفیت کا شکار تھے۔ اینگلو عربک اسکول اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ماحول میں زمین اور آسمان کا فرق تھا، یعنی وہی فرق جو کسی بھی اسکول اور یونی ورسٹی میں ہوسکتا ہے۔ لفظ پروفیسر ہم نے یہاں آکر واضح طور پر پہلی مرتبہ سنا تھا۔ البتہ رشید احمد صدیقی کچھ سنا ہوا سا نام لگتا تھا۔ چناں چہ جب سرسید ہال کے شرقی برآمدے میں شعبۂ اُردو کے دو دروازوں کے درمیان ایک تختی پر ہم نے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھا ہوا دیکھا تو سنا ہوا سا نام ہمیں اچانک مانوس سا محسوس ہونے لگا اور رشید صاحب جن کو ہم نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں تھا، ہمارے تصور کی آنکھ میں ایک باوقار شخصیت کی حیثیت سے آکھڑے ہوئے۔ ہم دونوں ان دنوں داخلے کا ٹکٹ ہاتھ میں لیے اپنے مطلوبہ شعبوں کی تلاش میں یونہی سرگرداں رہتے تھے۔ اب جو شعبۂ

اُردو اور رشید صاحب کے نام کی تختیاں نظر آئیں تو بالترتیب بوکھلاہٹ اور اشتیاق کے عالم میں ایک دروازے کی چق اٹھا کر اندر داخل ہوگئے۔ یہاں یہ عالم تھا کہ دائیں جانب ایک فولڈنگ پارٹیشن کھڑا تھا، جس نے اس ہال نما کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا اور اس کمرے کے جس حصے میں ہم کھڑے تھے یہاں ہُو کا سا عالم تھا نہ آدم نہ آدم زاد، نہ میز نہ کرسی، بس کمرہ در کمرہ ایک راستہ سا ہوتا ہوا پار چلا گیا تھا۔ ہم ابھی فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ کیا کریں کہ اچانک پارٹیشن کے دوسری طرف ہمیں کسی متنفس کے وجود کا احساس ہوا۔ ہم الٹے پاؤں اس دروازے سے باہر نکلے اور بغیر کسی توقف کے دوسرے دروازے کی چق اٹھا پھر اندر داخل ہوگئے۔ دیوار کے ساتھ ایک آرام کرسی لگی ہوئی تھی اور اس کرسی پر ایک صاحب چھریرے بدن کے سفید شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس، پتلی کمانی کی عینک لگائے، پان کھائے ہوئے، تشریف فرما تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ صاحب ہر اعتبار سے معقول معلوم دیتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی نہیں لگ رہے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے ہمارے علم اور حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے بالواسطہ طور پر ہم پہ واضح کردیا کہ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ہی ہیں۔ اس موقعے پر رشید صاحب سے جو سرسری گفتگو ہوئی اس کی ذرا وضاحت ضروری ہے۔ دلّی میں مسلمان لڑکیوں کے مدرسوں میں بالخصوص اور قرآن پڑھانے والی استانیوں کے گھروں میں بالعموم لڑکے اور لڑکیاں بزرگ مرد اور عورتوں کو خطاب کرنے سے پہلے جی کا لفظ بطور سابقہ (prefix) استعمال کرتے ہیں مثلاً ''جی ہم پانی پی آئیں''، ''جی ہم کل نہیں آئیں گے'' وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ اس وقت تک ہمارے فدوی پن کا دور ختم نہیں ہوا تھا اس لیے ہمیں بھی گفتگو کے دوران یہ ''جی والا'' سابقہ استعمال کرنے کی عادت تھی۔ چنانچہ جب رشید صاحب نے ہم سے پوچھا کہ ہم

لوگ کہاں سے آئے ہیں تو ہم نے جواب دیا، ''جی دہلی سے'' اور جب انھوں نے ہمارے اسکول کا نام پوچھا تو ہم نے کہا، ''جی اینگلو عربک''۔ اسی طرح اور کئی سوال ہوئے اور ان سب کا جواب ہم نے ''جی'' کے ساتھ ہی دیا۔ اس پر رشید صاحب نے ہم سے دریافت کیا کہ ہم لوگ دہلی کے رہنے والے ہیں یا کہیں پنجاب ونجاب کے ہیں اور دہلی سے ہوتے ہوئے علی گڑھ آرہے ہیں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم تو خاص دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اس پر رشید صاحب نے کہا کہ تقسیم کے بعد مہاجرین کی آمد سے شاید آپ کی زبان پر پنجابی کا اثر آگیا ہے کیونکہ گفتگو کے دوران پنجابی حضرات ہی کثرت سے ''جی'' کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ معما اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ ہم اس کا کوئی معقول یا نامعقول جواب ہی دے سکے۔ لیکن اب ہمارے پاس اس کا جواب ہے اور وہ یہ کہ پنجابی حضرات ''جی'' کے لفظ کو دلی والوں کی طرح بطور سابقہ نہیں بلکہ بطور لاحقہ (suffix) استعمال کرتے ہیں، مثلاً ''آو جی''، ''پرا جی'' وغیرہ وغیرہ۔ کاش یہ جواب اس وقت ہماری سمجھ میں آجاتا تو ہم رشید صاحب کو پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر کرلیتے جتنا آج تک نہیں کر پائے ہیں۔

علی گڑھ میں ہم نے جن دنوں پڑھا ہے اس زمانے میں اُستادوں کی کئی قسمیں تھیں۔ ان میں سے ایک قسم تو ان اُستادوں کی تھی جو خود بھی لاپتا رہتے تھے اور اپنے طلبا کا پتا بھی نہیں رکھتے تھے، ایسے اُستادوں میں مجھے اس وقت صرف ڈاکٹر خورشید الاسلام کا نام یاد آرہا ہے۔ اگر کبھی ہم خورشید صاحب کا یا خورشید صاحب ہمارا پتا پا جاتے اور ایسا اتفاق دونوں جانب سے ایک ساتھ ہی پیش آتا تھا تو پھر نہ میر کی خیر تھی اور نہ مرزا رسوا کی اور نہ ہماری۔ مکان کے کشادہ صحن میں خورشید صاحب چوپال جمائے بیٹھے ہیں، مائکروفون کی طرح حقہ سامنے رکھا ہے اور بس بولتے چلے جارہے ہیں اور گھنٹوں تک لیکچر

جاری ہے۔ دوسری قسم ان اُستادوں کی تھی جو نہ خود چین سے رہتے تھے اور نہ طلبا کو رہنے دیتے تھے، ایسے اُستادوں کی فہرست میں میں باوجود کوشش کے دو کے علاوہ تیسرا نام شامل کرنے سے قاصر ہوں۔ یعنی ڈاکٹر عزیر اور سید ظہیر الدین علوی صاحب۔ تیسری قسم اُستادوں کی وہ تھی جن کے بارے میں پرانے لوگوں سے سنتے تھے کہ وہ بھی اس شعبے میں پڑھاتے ہیں، وہ تھے جذبی صاحب اور چوتھی قسم کے اُستاد وہ تھے جو اپنے فرض منصبی سے تو غافل نہیں تھے لیکن جنھوں نے پڑھنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ رکھا تھا، ان میں ایک ڈاکٹر مسعود حسین خاں تھے اور دوسرے تھے رشید صاحب۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں شعبے کے پیچھے یونین آفس کے لان میں ہمیں بالِ جبریل اور رشید صاحب شعبہ کی پشت کی جانب ایک چھوٹے سے کمرے میں غالب پڑھاتے تھے۔ تاہم نبیل کچھ اس قسم کا تھا کہ جب رشید صاحب کو ہمیں پڑھانا ہوتا تھا تو سیدھے گھر سے رکشا میں بیٹھ کر آتے تھے اور ہمیں اکثر پارسل ایکسپریس کی طرح ان کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ظہور وارڈ کی بغل سے فراٹے کے ساتھ دھول اُڑاتی ہوئی، لڑھکتی ہوئی کم اور علی گڑھ کے مینڈک کی طرح پھدکتی ہوئی زیادہ جب کوئی رکشا ہلکے پھلکے اور تنہا رشید صاحب کو لیے ہوئے نمودار ہوتی تو اس کی کھڑکھڑاہٹ وہیں سے ہمیں صاف سنائی دیتی تھی۔ آج اس رکشا کا تصور کرتے ہیں تو رشید صاحب کے اُستاد پروفیسر انعام اللہ خاں کی ٹم ٹم کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔

رشید صاحب کے پڑھانے کا دستور یہ تھا کہ وہ بات کرنے کا موقع کم ہی دیتے تھے اور اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں جو کورس سے متعلق ہوسکتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے بڑے غور و فکر کے بعد ایک سوال رشید صاحب سے دریافت کرنے کے لیے تیار کیا، سوال یہ تھا ''کیا غالب فلسفی تھے؟'' حسب دستور رشید صاحب تشریف لائے،

حاضری لی اور حاضری کے رجسٹر پر سے نگاہ اٹھائے بغیر اسی پر 'دیوانِ غالب' رکھ کر کھول لیا۔ لیکن اس سے قبل کہ رشید صاحب اپنا لیکچر شروع کریں ایک طالب علم نے ہمت کر کے کہا، ''سر، ایک سوال دریافت کرنا ہے۔'' رشید صاحب نے گویا دیوانِ غالب ہی میں سے پڑھتے ہوئے جواب دیا، فرمایئے۔ طالب علم نے کہا، سوال یہ ہے کہ کیا غالب فلسفی تھے؟ رشید صاحب نے پھر اسی لب و لہجہ کو برقرار رکھتے ہوئے اور جواب کا سلسلہ لیکچر سے ملاتے ہوئے فرمایا، ''جی ہاں غالب فلسفی تھے۔ صفحہ بیالیس نکال لیجیے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں''

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید صاحب کلاس میں حاضری لے رہے تھے۔ حاضری لیتے ہوئے ایک نام پکارا ''وسیم فاضلی'' پہلی مرتبہ آج اس نام پر ''یس سر'' کی آواز آئی اور رشید صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ نیت توڑ کر نگاہ اوپر اٹھائی اور یس سر کہنے والے صاحب سے کہا، ''حضرت! اب تک نیاز کیوں حاصل نہ ہو سکے؟'' انھوں نے جواب دیا، ''بدنصیبی ہے۔'' رشید صاحب نے برجستہ سوال کیا، ''کس کی، آپ کی یا میری؟''

بہرحال میری خوش بختی ہے کہ میں نے رشید صاحب کو اتنا قریب سے دیکھا ہے اور وقتاً فوقتاً میں نے اپنے شاگردوں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان بھی کر دیا کرتا ہوں کہ میں رشید صاحب کا شاگرد رہ چکا ہوں۔

میں نے رشید صاحب کی شخصیت اور ذات کے بارے میں جب کبھی بھی اپنی رائے کا موازنہ دوسروں کے تاثرات کے ساتھ کیا ہے تو مجھے اس میں غالب کی شاعری کی طرح دو رائیں نظر نہیں آئیں۔

رشید صاحب نے علی گڑھ میں کچی بارک سے لے کر مولانا آزاد لائبریری تک ہر زمانہ دیکھا ہے لیکن عمارتیں چاہے گارے کی ہوں یا سنگ مرمر کی، کسی ادارے کی

روایات پر یہ چیزیں کم ہی اثر انداز ہوتی ہیں چنانچہ رشید صاحب کی کتاب 'آشفتہ بیانی میری' علی گڑھ کی ان زندہ جاوید روایات کا ایک مرقع ہے جو ہر دور کے علی گیرین کو اپنے ہی دور کی داستان معلوم دیتی ہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی رشید صاحب کے زمانے میں بھی تھی۔ ہمارے زمانے میں ڈیوٹی سوسائٹی کے معید خاں کو، جو کبھی ڈیوٹی لون نہ پانے والوں کے لیے لاحول ولاقوۃ اور ڈیوٹی لون پا جانے والوں کے لیے سبحان اللہ ہو جاتے تھے، کون نہیں جانتا۔

رشید صاحب کے ساتھیوں نے آکٹر لونی صاحب کو ٹینس کھلوادی تھی۔ ہم نے اولڈ بوائز لیسوسی ایشن کے پختہ لان میں ظہیرالدین علوی مرحوم کو بغیر کسی کے کھلوائے ٹینس کھیلتے دیکھا ہے۔ ڈائننگ ہال کا کھانا کھاتے ہوئے شاید آج بھی طلبا یہ شرطیں لگاتے ہیں۔ ''بتاؤ کیا پکا ہے'' اور خدا جانے فوڈ مانیٹروں نے میس کنٹریکٹر کے بل پر اب پہلوانیاں کرنی چھوڑ دی ہیں یا اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ علی گڑھ کے اسپتال کا نقشہ رشید صاحب نے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے لیکن بعد کے زمانے میں کپتان حفیظ اور عبد المعشوق کی ہستیاں بھی کچھ کم تاریخی نہیں رہیں۔

رشید صاحب نے بقول خود طنز و ظرافت کی ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال سے شروع کی لیکن کمال یہ ہے کہ ان کیفیات کو انھوں نے ایسے معروضی انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر شخص لطف لے سکتا ہے۔ علی گڑھ سے متعلق لوگوں کے لیے البتہ ان کے مطالعے سے

میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن علی گڑھ کے ماحول کو رشید صاحب نے اپنے طنز و مزاح کی ترویج کا ذریعہ بنایا اور نہ طنز و مزاح کو اپنی شہرت کا بلکہ ان کی تحریروں میں علی گڑھ

کے ساتھ اس تعلق اور خلوص کا جذبہ بھی کارفرما ہے جس کا اظہار انھوں نے 'آشفتہ بیانی میری' میں ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز وظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔''

رشید احمد صدیقی کا تعلق ان مزاح نگاروں سے ہے جنھیں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصہ میں شہرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں رشید صاحب کے ساتھ پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے نام لیے جاسکتے ہیں — لیکن رشید صاحب کی وفات سے پہلے یہ سب ہی اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ رشید صاحب نے جس طرح ان سب کے مقابلے میں طویل عمر پائی ہے، اسی طرح ادب میں بھی ان سب کے مقابلے میں شاید دیرپا رہیں۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کو ایک زمانے میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ ان کے ہمعصروں میں شاید کسی کو نصیب نہ ہوئی ہو۔ لیکن ان دونوں کے ہاں طنز وظرافت کا ایک کوٹا مقرر تھا اور وہ کوٹا ختم ہوجانے کے بعد یہ لوگ پرانے ریکارڈ ہی الٹ پلٹ کر بجاتے رہے۔ عظیم بیگ چغتائی تو پھر بھی ایک نقش پا چھوڑ کر رخصت ہوئے لیکن شوکت تھانوی کی عمر ان کے ساتھ وفا کے ساتھ دغا بھی کرتی رہی چنانچہ زود نویسی اور تکرار مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں تنوع ختم ہوتا چلا گیا اور جیسا کہ بعض ناقدین کا خیال ہے، ان کا مزاح ایک انڈر گریجویٹ سطح کی چیز ہوکر رہ گیا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے مقابلے میں پطرس کہیں زیادہ ذہین ہیں۔ بظاہر اپنے ہم عصروں میں ان کا قد سب سے اونچا نظر آتا ہے۔ لیکن شائستگی، سوجھ بوجھ، سنجیدگی، متانت اور غور وفکر کا جو عنصر رشید صاحب کے ہاں ہے، اس تک

پطرس بھی نہیں پہنچ پائے۔ رشید صاحب نے ساری عمر لکھا ہے اور پطرس سے کہیں زیادہ لکھا ہے۔ وہ مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر انشا پرداز بھی ہیں۔ ان کے پاس ایک اسلوب نگارش ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ علی گڑھ میں رہے ہیں جہاں انھوں نے اپنے طنز ومزاح کی عمارت کو قیاس پر نہیں مشاہدے پر کھڑا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں تلوّن بھی ہے اور تنوع بھی۔ سرورؔ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پطرس اپنی ظرافت کے لیے خام مواد زندوں سے لیتے ہیں، فرحت اللہ بیگ مردوں سے اور رشید احمد صدیقی شعر وادب سے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعر وادب کے عمیق مطالعے سے ان کے فکر اور فن دونوں میں بے پناہ شائستگی پیدا ہوئی ہے وہ غالبؔ کے اشعار سے اکثر کام لیتے ہیں، لیکن وہ اپنے طنز ومزاح پر غالبؔ کے اشعار کا اطلاق نہیں کرتے بلکہ غالبؔ کے اشعار پر اپنے طنز ومزاح کا اطلاق کرتے ہیں۔ ان کا طنز انتہائی شائستہ اور تیکھا ہوتا ہے جس کی مثال اس پتلی نوکدار سنگین کی سی ہے جو بغیر کسی تکلیف کے جسم کے پار ہوسکتی ہے مگر جس کا نتیجہ معلوم۔

رشید صاحب کو اپنے قلم پر بے پناہ عبور حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ محض 'خنداں' یا 'مضامین رشید' کے ہی مصنف ہوکر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے دوستوں اور ہم عصروں کی قلمی تصویریں بھی بنائی ہیں، زبان اور ادب پر بحث کی ہے، رپورتاژ لکھا ہے اور طنز اور مضحک جیسے غیر سنجیدہ موضوع پر اپنی تمام تر ظرافت طبع کے باوجود ایک سنجیدہ کتاب تالیف کی ہے۔ اس اعتبار سے رشید صاحب اور ان کے ہم عصر مزاح نگاروں میں وہی فرق ہے جو عام عورتوں میں جاپا کرانے والی دائی میں ہوتا ہے۔ عام عورتیں صرف بچہ جننا جانتی ہیں جب کہ دائی بچہ جننا اور بچہ جنوانا دونوں جانتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم عصر مزاح نگاروں میں ان کا مرتبہ غالباً سب سے بلند ہے۔

عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی وغیرہ کے مضامین ہم میں سے اکثر اسکول کے زمانے میں پڑھ چکے ہیں۔ جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ انڈر گریجویٹ سطح کا یہ طنز و مزاح میٹرک کی سطح پر انتہائی پرلطف اور غیر معمولی معلوم دیتا ہے لیکن رشید صاحب کو ہم اکثر کالج پہنچنے کے بعد پڑھنا شروع کرتے ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔ پطرس کے ہاں جو شگفتگی اور بے ساختگی ہے اس کا یقیناً کوئی جواب نہیں لیکن پطرس کے مضامین محض انتہائی پرلطف محفلوں کا مزا دیتے ہیں اور جس طرح کسی اچھی فلم کو دو چار بار دیکھنے کے بعد اس کا جادو ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح پطرس کے مضامین بھی دو تین بار کے مطالعے کے بعد پھیکے لگنے لگتے ہیں۔ یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ شوکت تھانوی کے نئے سے نئے مضامین میں علیٰ ہذالقیاس قسم کی جو کیفیت ہے، اس کے مقابلے میں پطرس کے ایک ہی مضمون کو بار بار پڑھنے میں پھر بھی زیادہ لطف آتا ہے۔ رشید صاحب کا کمال یہ ہے کہ ایٹم کی حشرناک طاقت کی طرح ان کا مزاح لب و لہجہ کی سنجیدگی اور متانت میں پوشیدہ رہتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ لیکن یکے بعد دیگرے جب ان کے کئی فقرے دماغ کے مساموں کو جا کر چھوتے ہیں تو ذہن میں ایک ہلکی سی گدگدی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور آپ پڑھتے پڑھتے خود بخود مسکرانے لگتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم رشید صاحب کی تحریر ہنستے ہوئے نہیں پڑھتے بلکہ پڑھتے ہوئے ہنستے ہیں۔ رشید صاحب زندگی بھر علی گڑھ میں رہے لیکن ان کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں علی گڑھ میں ہی عدالت، ڈائننگ ہال، مجسٹریٹ، مولوی، آئی.سی.ایس، فدوی، وکیل، دھوبی، لیڈر، بیرا، یکہ، چارپائی، الیکشن، وعظ، کونسل، ارہر کا کھیت، عاشق، بہشتی، دربان، شاعر، سرقہ، فاؤنٹین پین، ایڈیٹر، ناصح، کنویز، رقیب، پولیس، قوم، عورت، بلوہ، سوداگر، محبوب، نمازی، شرابی، مدرسہ، جیل خانہ، آفس، آخرت، گھاگ، صوفی غرض سب ہی میسر تھے۔ رشید صاحب ایسے تمام

لوازمات کو انتہائی ذہانت، برجستگی، رعایت لفظی اور حسن تضاد کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ رشید صاحب اپنے گردوپیش کی دنیا سے بخوبی باخبر ہیں لیکن جب وہ ان چیزوں کا ذکر اپنی تحریروں میں کرتے ہیں تو ہر چیز سے بالکل بے تعلق نظر آتے ہیں حتیٰ کہ بیوی بچوں تک سے۔ وہ ہر جگہ کا نقشہ انتہائی معروضی انداز میں پیش کرتے ہیں اور خود موقعۂ واردات سے اسی قدر دور نظر آتے ہیں جتنا سینما کے پردے سے سینما دکھانے کی مشین۔

رشید صاحب ایک مخلص اور دوست قسم کے انسان ہیں، یہی ان کا مسلک ہے اور یہی ان کا مشرب۔ انھیں نہ سیاست سے غرض نہ انقلاب سے، وہ نہ اصولوں کے غلام ہیں نہ آدرشوں کے پجاری۔ علی گڑھ ان کا اوڑھنا بچھونا اور عزیز و اقارب ان کے ملجا اور ماوا ہیں۔ یہی ان کی دنیا ہے اور یہی ان کا عقبیٰ۔ چنانچہ ذاکر صاحب ہوں یا ایوب، وہ دونوں کے عاشق اور پرستار ہیں۔ بقول سرور صاحب 'اگر بقراط اور جالینوس بھی مقابل ہوں تو ان کا ووٹ دوست ہی کو جائے گا۔' یہی وہ جذبہ ہے جس نے انھیں 'گنج ہائے گراں مایہ' جیسی کتاب کا مصنف بنایا ہے۔

رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین 'خنداں' اور 'مضامین رشید' کے نام سے بار بار شائع ہو چکے ہیں، 'خنداں' کے مضامین اصل میں ریڈیو کے لیے لکھی گئی ہلکی پھلکی تقریریں ہیں۔ ریڈیائی تصانیف میں چونکہ پیمانہ و صہبا کے بجائے ریڈیو کی بیخ یعنی سرکاری مائک مصنف کے پیش نظر رہتا ہے اس لیے انداز گل افشانی گفتار کا موقعہ کم ہی ملتا ہے تاہم 'خنداں' کے مضامین کی زبان اور محاورہ سادہ اور عام فہم ہے اور جو لوگ رشید صاحب کے مرتبے سے پوری طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے 'خنداں' بھی ایک شاہکار ہے مگر ان کا اصل رنگ بھرپور طریقہ پر 'مضامین رشید' میں ہی اُجاگر ہوتا ہے جہاں وہ سنسر فری قلم چلاتے ہیں۔

رشید صاحب کو ان کی کتاب 'غالب کی شخصیت اور شاعری' پر ساہتیہ اکادمی انعام ملا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ان کے نظام اُردو خطبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے ۱۹۶۹ء میں شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی میں دیے تھے۔ میں نے اب تک رشید صاحب کی جتنی بھی تحریریں پڑھی ہیں ان میں متابلتاً اس کتاب کو زیادہ سنجیدہ پایا ہے۔ ظاہر ہے اس موضوع میں خصوصاً، جب کہ اسے خطبات کی شکل میں پیش کرنا ہو، کسی مزاح کی گنجائش بھی نہیں لیکن اس کے باوجود لب ولہجہ کی شگفتگی اور اسلوب نگارش یہاں بھی اپنا جادو دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو:

"بہ غرض احتیاط یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج گفتگو کے دو حصے ہیں، ایک غالب کی شخصیت اور دوسرا ان کی شاعری سے متعلق ہے لیکن کہیں کہیں یہ خلط ملط ملیں تو عجب نہیں۔ یہ قصور میرا ہے جس میں غالب کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔ غالب پر سوچیے تو ان کا کلام اور ان کے کلام پر غور کیجیے تو غالب بن بلائے سامنے آجاتے ہیں۔ اچھے شاعر اور ان کے کلام کا حال کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے لیکن یہ میری طرز فکر کا بھی قصور ہو سکتا ہے جس طرح پیکر تراشی شعرا کا بہت بڑا ہنر ہے، اسی طرح شاعری میں شخص کو تلاش کرنا میری بڑی کمزوری ہے۔ اسے معاف فرمائیں یا نہیں مجھے معذور ضرور سمجھیں۔"

❁❁❁

ابوالکلام آزاد

بائیس فروری ابوالکلام آزاد کا یومِ وفات ہے۔ اس موقعے پر بھولے بسرے اُردو کے کسی اخبار میں یا کبھی کبھار ریڈیو کے چھوٹے موٹے پروگرام میں آزاد کو یاد کر لیا جاتا ہے باقی خیریت۔ چلیے 'ایں ہم بسا غنیمت است'۔

ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے بارے میں سوچنا شروع کیجیے تو نگاہ ان کی عملی زندگی کے کارناموں سے ہوتی ہوئی 'غبار خاطر' پر جا کر اٹک جاتی ہے اور پھر سوچتے سوچتے معاً یہ خیال آتا ہے کہ آزاد ایک ہی ساتھ دو شخصیتوں کے مالک تھے۔ ان کی دونوں ہی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ بڑی تھیں، فرق صرف یہ ہے کہ ایک شخصیت کی تعمیر انھوں نے خود کی اور دوسری ان کے اندر بنی بنائی موجود تھی۔ جس شخصیت کی تعمیر ابوالکلام آزاد نے خود کی تھی، اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن ان کی بنی بنائی شخصیت کے بارے میں کم ہی لوگ کچھ جانتے ہیں۔ آزاد کی جانی پہچانی شخصیت میں بے پناہ دبدبہ ہے اور ان کی پوشیدہ شخصیت میں بلا کا بانکپن۔ یہ دونوں شخصیتیں کم و بیش ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور اسی تضاد کی بنا پر ان دونوں کے درمیان کبھی کسی قسم کے تصادم یا ٹکراؤ کی صورت پیش

نہیں آئی۔ تصادم تو دراصل وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو چیزیں ایک ہی نقطے پر آ کر جمع ہوجاتی ہیں۔

آزاد کی پوشیدہ شخصیت بڑی پُرکشش ہے لیکن اپنی اس کشش کے باوجود یہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتی، اس کے برعکس ان کی معروف شخصیت انتہائی پُرہیبت ہونے کے باوجود پائیڈ پائپر آف ہیملین کی طرح ایک انبوہ کثیر کو اپنے پیچھے کھینچے لیے جاتی ہے۔

'غبار خاطر' میں ابوالکلام آزاد کی یہ دوسری شخصیت بوتل میں جن کی طرح بند ہے۔ قلعۂ احمد نگر کے پہلے ہی مکتوب میں آزاد نے اپنی نثر میں اشعار کی پیوندکاری کا سلسلہ غالبؔ کے اس شعر سے شروع کیا ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

آزاد نے غالبؔ کا شعر تو نقل کردیا لیکن اس شعر میں جو مسئلہ درپیش ہے وہ دراصل غالبؔ ہی کا ہے آزاد کا نہیں۔ جب قلعۂ احمد نگر میں ابوالکلام آزاد کی 'خاطر' پر رومانیت کا 'غبار' چھانا شروع ہوا تو ان کا حال بقول میر حسن یہ تھا:

دامنِ صحرا سے اٹھنے کو حسنؔ کا جی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

اور اس بات کے ثبوت میں ملاحظہ ہو 'غبار خاطر' کا یہ اقتباس:

"گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسب معمول علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی

دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ ہا، مخلص خان عالم گیری نے کیا خوب لف ونشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوق سخن میں میرا ساتھ دیجیے:

خمارِ ما و درِ توبہ و دلِ ساقی
بیک تبسمِ مینا شکست و بست و کشاد

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے، مگر فکر و تصور کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جاسکتے ہیں تو کون ایسا زیانِ عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں"

غالبؔ نے ایک بات اور بھی کہی تھی اور وہ یہ کہ:

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

یہاں بھی غالبؔ کے اس شعر کی الٹی تعبیر ہی ابوالکلام آزاد کے حال پر سیدھی ثابت ہوتی ہے۔ آزاد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی عملی سرگرمیوں میں اتنے مجنونانہ طریقے سے مستغرق تھے کہ انھیں کشاکشِ غمِ پنہاں میں پڑنے کی فرصت بس گاہے گاہے ہی مل سکی۔ عمرِ عزیز کے ستر سالوں میں سے انھیں کشاکشِ غمِ پنہاں میں مبتلا ہونے کا موقع مختلف وقفوں کے ساتھ صرف دس سال ہی میسر آسکا، یعنی ان کی جیل کی زندگی کے مجموعی دس سال۔ ان دس سالوں میں وہ آخری تین سال انتہائی شدت کے تھے جو انھوں نے قلعۂ

احمد نگر کی جیل میں گزارے۔ یوں بھی اب وہ عمر کی اس منزل تک پہنچ چکے تھے جہاں وہ ضروری سمجھنے لگے تھے کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے اپنی اس پوشیدہ شخصیت کے چہرے پر سے بھی نقاب اٹھادیں۔ چناں چہ احمد نگر جیل میں بیٹھ کر انھوں نے فرصت کے ساتھ اپنے جی کا 'غبار' نکالا۔ اس طرح اس 'غبار' کے چھٹ جانے کے بعد ان کی وہ دوسری شخصیت بے نقاب ہوکر سامنے آئی جو ان کے اندر روز اول ہی سے بنی بنائی موجود تھی۔ اس اعتبار سے 'غبار خاطر' ابوالکلام آزاد کی کشاکش غم پنہاں کی ایک دلچسپ داستان ہے۔

آزاد میدانِ کارزار میں ہوں، کشاکشِ غمِ پنہاں کی کیفیت میں ہوں یا صدیق مکرم کے ساتھ محوِ گفتگو ہوں، ہر عالم میں وہ تمام مرتبہ اقدار کو ٹھوکروں سے اڑاتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کے اندر جو باغی انسان تھا، اس نے اپنے مزاج کے علاوہ کبھی کسی کی اطاعت قبول نہیں کی۔ وہ ہر طرح کی قید سے آزاد ہو کر صرف اپنی دھن میں مگن رہنا جانتے تھے۔ بقول ان کے:

"میں نے 'آزاد' کا عرف اختیار کیا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں روایتی اور موروثی عقائد کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں"۔

(انڈیا ونز فریڈم)

اس طرح اس باغی انسان نے اپنے والدین، اپنے خاندان اور اپنی وراثت سے بغاوت کی۔ اس بغاوت میں خوش حال گھرانے کی مادی آسائشوں کو تج دینے کے ساتھ وہ اقدار اور عقائد بھی شامل تھے جو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملے تھے۔ اگر ابوالکلام آزاد اسلام کے پیرو تھے تو یہ اسلام وہ نہیں تھا جو عام طور پر ہر مسلمان بچے کو اپنے والدین سے ورثے میں ملتا ہے۔ وہ اسلام تو خاندانی مال ومتاع کے ساتھ وہ اپنے

اسلاف کو لوٹا کر کب کے کافر ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے اسلام کو ازسرِ نو اسی طرح دریافت کیا تھا جس طرح حضرت محمدؐ کے زمانے میں اسلام قبول کرنے والے کفار مکہ نے کیا تھا اور مکے کے یہ کفار کچھ کم آن بان والے لوگ نہیں تھے۔

ملاحظہ ہو غبار خاطر کی یہ عبارت:

"عام حالت میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے، اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا؟ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی، جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ البتہ جو عقیدہ کھویا تھا وہ تقلیدی تھا، اور جو عقیدہ پایا وہ تحقیقی تھا۔"

ابوالکلام آزاد کو ایک سیاسی مدبر اور قومی ہیرو کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہوئی، اس کی مثال خود آزاد کی پہلو دار شخصیت کے تناظر میں پانی کے اس تیز و تند دھارے کی سی ہے جس کی قوت کو اسیر کر کے اس سے بجلی پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور اس بات کا بھید کھلتا ہے ان سرگوشیوں سے جو انھوں نے 'غبار خاطر' میں جا بجا کی ہیں۔ مثلاً:

"میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میری اختیار کی پسند نہیں ہوتی۔ اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالبؔ کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما"

قومی زندگی میں بجلی پیدا کر دینے والے اس تیز و تند دھارے کا فطری رو
ہے جہاں وہ اونچی چٹانوں سے چھلانگیں لگاتا، وادیوں میں مچلتا اور میدانوں میں
ہوا چلتا ہے اور اپنی رفتار کی ہیبت اور شور سے کسی کو آس پاس آنے کا موقع نہیں دیتا
یوں وہ اپنی اس تنہائی کو برقرار رکھتا ہے جو اس کی متاع بے بہا ہے۔ ملاحظہ ہوں
کے یہ الفاظ:

"اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے، تو اس حالت کی جو رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں، میرے لیے یک سوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کرسکتیں۔ میں جب قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہوسکتی ہے! اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جاسکیں۔"

'غبارِ خاطر' میں چھپی ہوئی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی
کہ وہ ابوالکلام آزاد کی مشہور و معروف اور عوامی شخصیت کے لیے ایک تازیانے کا کام
کرتی رہی ہے۔ ابوالکلام آزاد کی معروف شخصیت نے تو ابوالکلام آزاد کی غیر معروف
شخصیت کو کچھ نہیں دیا لیکن ان کی یہ چھپی ہوئی شخصیت ان کی عوامی شخصیت کی رگوں میں
دہقاں کے گرم خون کی طرح ضرور دوڑتی رہی ہے۔ گویا 'غبارِ خاطر' کا آزاد 'ہیولہ برق

خرمن کا ہے' اور 'غبارِ خاطر' کے باہر کا آزاد 'خونِ گرم دہقاں کا'۔

'غبارِ خاطر' کی چہاردیواری میں رہنے والا آزاد ایک ارسٹوکریٹ انسان ہے۔ اس کے اندر نفیس قسم کا جاگیرداری مذاق پوری طرح رچا ہوا ہے۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ اختلاط پسند کرتا ہے ان کا تعلق سماج کے طبقۂ اشرافیہ سے ہے جن میں ایک تو خود 'غبارِ خاطر' کے مخاطب ہی ہیں۔ وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، غرض ہر چیز کے بارے میں ایک خاص طرح کے ایٹی کیٹ کا خیال رکھتا ہے۔ زمین پہ رہنے والے عام ہندوستانی کی زندگی کا کھردراپن اس کے مزاج اور طرزِ زندگی سے کوسوں دور تھا۔

اس نے اگرچہ وراثت میں ملنے والے تمام رئیسی ٹھاٹ کو لات ماردی تھی لیکن وہ اپنے رئیسی مزاج کو کبھی شکست نہیں دے سکا۔ ہوسکتا ہے، اس کی اس نفسیاتی گرہ کا کوئی سرا جاکر اس کی انا سے ملتا ہو۔ چناں چہ اسی رئیسی مزاج کی بدولت وہ قحطِ بنگال کے دنوں میں احمد نگر کی جیل میں بیٹھا روسی فنجانوں میں چین کی نایاب وائٹ جیسمن چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور انھیں چسکیوں کی تان پر 'غبارِ خاطر' کی رومانی نثر تخلیق کرتا رہا۔ وائٹ جیسمن میں گھلی ہوئی یہ نثر اور اس نثر میں دم کی ہوئی وائٹ جیسمن کا ذرا سا ذائقہ آپ بھی چکھتے چلیے:

"میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشے کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے

صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما"

ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے آج بھی اور اس دور میں تو خاص طور پر جاڑے کا موسم ایک بہت بڑا عذاب تھا جہاں بہت سے لوگوں کے پاس ٹھیک سے تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے نہ ہوں، رہنے کے لیے مکان نہ ہوں، وہاں جاڑے کے موسم کو مر کر یا جی کر برداشت تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسے عیش وطرب کا سامان نہیں بنایا جاسکتا۔

ذرا 'غبارِ خاطر' کے جھروکے سے جاڑے کا یہ منظر بھی ملاحظہ ہو:

"میں آپ کو بتلاؤں، میرے تخیل میں عیشِ زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہوسکتا ہے؛ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتش دان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں۔"

ابوالکلام آزاد نے مادی زندگی کی ان آسائشوں کو تو خیرباد کہہ دیا تھا جو انھیں ورثے میں ملنے والی تھیں لیکن وہ اپنے مذاقِ سلیم کے آگے گھٹنے ٹیکتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم ہندوستانی عوام کے اس خادم کو اس کے مذاقِ سلیم کے لیے اس لیے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے اپنے اس مذاق کی تسکین کا جو بھی ساماں کیا، وہ اپنے بل بوتے پر کیا۔ اس کے لیے اس نے وراثت یا سماج سے نہ کوئی مراعات چاہیں اور نہ اس کے

حصول کے لیے ناجائز حربے استعمال کیے۔ یوں بھی یہ تو 'غبارِ خاطر' کے اندر رہنے والا آزاد ہے، اس لیے اس کی شخصیت کو اس ابوالکلام آزاد کے ساتھ خلط ملط کرنا شاید مناسب نہیں جو ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک عظیم ہیرو ہے۔

❁❁❁

سِرکے کی بوتل

ظ انصاری

میں نے اب تک ظ انصاری کی تمام کتابیں اپنے پیسے سے خرید کر پڑھی ہیں۔
'کانوں کی زبان' ان کی پہلی کتاب ہے جو مجھے مفت ہاتھ لگی ہے اور یہاں مفت ہاتھ لگنے پر آپ یہ نہ سوچنے لگیں کہ میں غالبؔ کے اس شعر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں:

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

بالفرض ایسا ہی ہے تو بھی 'غالب شناس' یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ شعر کے اصل معنی تو 'ہم نے مانا' ہی میں چھپے ہیں باقی سب تو ریاکاری ہے۔ بہرحال مجھے تو یہاں مفت ہاتھ لگنے پر فارسی کا یہ مصرع یاد آ رہا ہے: 'سرکہ' مفت از عسل شیریں تر است'۔ ہمارے ایک معمر دوست جو بہت اچھے باتونی بھی تھے، اپنی گفتگو میں بیچ بیچ میں انگریزی کے وکٹورین عہد کے محاوروں کا استعمال خوب کرتے تھے چناں چہ اس موقعے کے لیے ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک انگریزی محاورہ بھی سن لیجیے۔ محاورہ ہے Nobody looks into the mouth of a gift horse. اب فارسی اور انگریزی کے ان دونوں مقولوں پر غور

کیجیے تو بظاہر مفہوم ایک ہی ہے اور ایک کو بہ آسانی دوسرے کا بامحاورہ ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی دونوں میں ایک فرق ہے، دو تہذیبوں کا فرق۔ فارسی محاورے میں شائستگی ہے اور انگریزی محاورے میں ارسٹوکریسی، ایک طرف مفت کے مال کو شہد سے زیادہ میٹھا قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف بقول حالیؔ: 'بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں' والی صورت ہے۔ اس لیے میں یہاں شائستگی سے کام لیتے ہوئے 'شیریں تر است' کو ہی ترجیح دوں گا۔ جی ہاں، میں نے 'از عسل شیریں تر است' کے موقف کو ترجیح تو دے دی لیکن اس میں ایک بات 'کانوں کی زبان' جیسی تیکھی یہ ہے کہ سرکہ، سرکہ ہی ہے اور شہد، شہد۔ اب اس سے پہلے کہ ظ انصاری بوکھلا اٹھیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کا ایک قاری بوکھلا اٹھا تھا اور اس نے علمائے فحول کو علمائے مخول پڑھ دیا تھا، مجھے بجلی کی سرعت کے ساتھ یہ عرض کر لینے دیجیے کہ میں ظ انصاری کے سرکے کو ظ انصاری ہی کے شہد کے تناظر میں سرکہ کہہ رہا ہوں۔ اس بات کا سلسلہ خسرو سے منسوب اُن مِل بے جوڑ کی طرح اس تحریر کے آخر میں جوڑنے کی کوشش کریں گے، اس دوران اصل بات کر لی جائے۔

لکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جنھیں قدرت نے اصل میں گھاس کھودنے کے لیے پیدا کیا تھا لیکن انھوں نے کھرپی چھوڑ قلم پکڑ لیا، یہاں گھاس کھودنے سے مراد لکھنے کے علاوہ انسان کی بقیہ تمام صلاحیتوں سے ہے۔ لکھنے والوں کی دوسری قسم وہ ہے جہاں لکھنا خود لکھنے والے کے وجود کے اندر سے پھوٹتا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح گلزارِ نسیم کا تاج الملوک سرنگ کے راستے بکاولی کے باغ میں 'بوتا ساز میں سے باہر آیا'۔ ظ انصاری کا تعلق لکھنے والوں کی اسی قبیل سے ہے۔ پہلی قسم کا لکھنے والا صرف شہرت اور ناموری کے لیے لکھتا ہے اور اپنے لکھنے کے 'کاروبار' میں، ملاحظہ ہو 'کاروبار'

یہاں واوین میں ہے، ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے جب کہ دوسری قسم کا لکھنے والا ایسے قاری کی جستجو میں رہتا ہے جس کے پاس احساس و ادراک کا، سخن فہمی اور سخن سنجی کا وہی ویولینتھ ہو جس ویولینتھ پر لکھنے والے نے اپنی آواز کا صور پھونکا ہے یعنی ایسے لکھنے والے اور ایسے لکھنے والے کے قاری کے درمیان لگ بھگ وہی رشتہ ہوتا ہے جو براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور ریڈیو سیٹ کے درمیان ہوتا ہے۔ اب آجایئے غالبؔ کے اس شعر پر:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

گویا لکھنے والے کے قلم کو کاغذ کی چاٹ تو ہوتی ہی ہے، اس کے ساتھ اسے ان آبلوں کی پیاس بھی ہوتی ہے جو اس کے قاری کے وجود میں پھل رہے ہیں۔ اس لیے اس عنوان کے وسیلے سے غالبؔ کے پورے شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ظ انصاری بین السطور میں یہی تو کہنا چاہتے ہیں کہ بھائی میرا قلم آپ کے تلوے چاٹنے کو تیار ہے بشرطیکہ ان تلووں میں چھالے ہوں، شدّتِ احساس کے چھالے۔ اسی بات کی توثیق غالبؔ ہی کے ایک اور شعر سے ہوتی ہے جسے قاری کی پوزیشن سے دیکھا جاسکتا ہے یعنی:

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر!

گویا قاری کو جب کوئی ادبی شہ پارہ اپنی کیفیت کے مطابق مل جاتا ہے تو اسے پڑھ کر یا اسے نقل کر کے دل کی ساری بھڑاس نکل جاتی ہے اور اس کے لکھنے والے کو بے ساختہ اس طرح داد دینے کو جی چاہتا ہے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دیکھیے پھر آن پکڑا غالبؔ نے۔ اور یہ غالب کا ذکر کوئی موضوع سے ہٹ کر نہیں ہو رہا ہے بلکہ شاید اس طرح ہم رفتہ رفتہ اپنے موضوع کے بطون میں سرایت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ غزل بڑی بڑی صنف ہے تو ظ انصاری، کلیم الدین احمد کی طرح بھڑک اٹھیں گے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ غزل کا شاعر غالبؔ بڑی کافر چیز ہے تو ظ انصاری اپنے مخصوص انداز میں پھٹی آنکھیں اور پورا منہ پھاڑ کے اور اپنے ہاتھ میں ہماری بات کا وزن تولتے ہوئے کہ اٹھیں گے 'دریں چہ شک'۔ اس لیے کہ وہ پچھلے کئی عشروں سے غالبؔ کی گرفت میں ہیں۔ اور باز کے پنجوں میں شکرے کی طرح پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ یہاں عشروں کی جگہ دہوں بھی کہا جاسکتا تھا لیکن ظلِ حسن یا ظلِ حسنین کی رعایت سے عشرے کہنے میں زیادہ لطف آ رہا ہے اس لیے کہ 'منم غلام علی'۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ غالبؔ پر کسی بھی ادیب یا محرر کو قلم اٹھانے کا حق ہے لیکن غالبؔ جن بلندیوں پر ہے وہاں اگر آپ اس کے مرتبے تک نہ پہنچ پائیں اور صرف پنجوں کو ہی چھو کر رہ جائیں تو بھی سمجھ لیجیے کہ آپ نے پالا مار لیا، اس لیے کہ باز کی بلندی کی حدود اس کے پنجوں سے شروع ہوجاتی ہیں۔

ظ انصاری کو پڑھنے سے زیادہ انھیں سننے میں مزہ آتا ہے اس لیے کہ وہ لفظ کو لکھتے نہیں، الاپتے ہیں اور اس الاپ میں سُر اور تال کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا اصل لطف لینے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ نے انھیں کہیں بولتے یا پڑھتے ہوئے سن رکھا ہو، تاکہ آپ ان کے تیور اور ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہوجائیں۔ اس کے علاوہ کسی صاحبِ طرز کی تحریر میں بہت سی پیچیدگیاں عبارت کے پنکچوایشن میں بھی مضمر ہوتی ہیں، جس کے استعمال کا اردو میں خاطر خواہ رواج نہیں ہے۔

ماہرین لسانیات نے اسی لیے speech ہی کو اصل زبان مانا ہے اور تحریر کو صرف زبان کے اظہار کا ذریعہ اور قدرے ناقص ذریعہ قرار دیا ہے۔ زبان صرف الفاظ تک محدود نہیں بلکہ آواز کی گرمی یا نرمی، لہجے کے اتار چڑھاؤ اور بات کرنے کے تیور، یہ سب مل کر اظہار کو آخری شکل دیتے ہیں۔ لغت تو صرف الفاظ کا مردہ خانہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو لغت کے عالمِ وجود میں آتے ہی تشریح، تفسیر، تبصرہ اور توضیح یہ تمام چیزیں بالکل اسی طرح ازکار رفتہ ہوجاتیں جس طرح ٹیلی وژن کے آنے کے بعد فلم، تھیئٹر، ریڈیو اور ہمارا اخلاق سب بے معنی ہوگئے ہیں۔ لفظ ایک بے جان شے ہے اور یہ 'بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں'۔ لفظ کے معنی اس کے مکمل سیاق وسباق میں ہی متعین ہوسکتے ہیں اور لفظ کا ایک اہم سیاق و سباق اس کا لکھنے والا بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف سیاق و سباق میں مختلف معانی کا حامل ہوتا ہے اور یہی زبان کی وہ پراپرٹی ہے جسے ہم پروڈکٹیوٹی کا نام دیتے ہیں، اگر ہم بغیر سیاق وسباق کے کسی سے یہ کہہ بیٹھیں کہ 'یہ پاجی پن ہے جناب' تو اس کے جواب میں ہمارے جھانپڑ بھی پڑسکتا ہے اور ہم پر ہتک عزت کا دعوا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر یہی بات اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ سامنے آئے تو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر بکنے کے باوجود کوئی آپ سے پلٹ کر یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ 'یہ کیا پاجی پن ہے جناب'۔

بعض خاصے سنجیدہ لوگوں نے صحافت کو ادب سے کم تر درجے کی چیز قرار دیا ہے اور کسی حد تک یہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ دراصل اُردو میں نثر کا باقاعدہ کاروبار انیسویں صدی کے اواخر میں اچانک اس دھڑاکے سے شروع ہوا کہ نثر کی ساری روایتوں نے ایک ساتھ جنم لے لیا اور اس آپا دھاپی میں خصوصی میدان کے رواج کو صحیح طرح فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ اُردو کے بیشتر بڑے لکھنے والے ہرفن مولا بن گئے، اور ان فنون میں

صحافت بھی شامل تھی چناں چہ غالبؔ کے طرف داروں نے کہا کہ صحافت کو کم رتبہ کون کہتا ہے، یہ دیکھیے صحافت کے میدان میں سید احمد خاں، ابوالکلام آزاد، شرر، نیاز فتح پوری، حسرت موہانی اور فلاں اور فلاں اور ظ انصاری کون نہیں ہے۔ دراصل ہمارے بڑے ادیبوں کے لیے صحافت ایک 'ماندگی کا وقفہ' رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علاوہ جو لوگ صحافت میں آئے وہ بالکل ہی گئے گزرے ثابت ہوئے جب کہ صحافت کو اصل میں چاہیے تھے فل ٹائم میڈیوکرز۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو 'ترجمان القرآن' کی بقیہ تمام جلدیں ہمارے سامنے آگئی ہوتیں اور شاید دوسری طرف اُردو کے کئی اچھے رسالے بھی بند نہ ہوگئے ہوتے۔ بڑے ادیب کو صحافت میں ڈال دیجیے تو وہ ریڑھے کا ٹٹو ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، صحافت کی کچھ مجبوریاں ہی ایسی ہیں۔ شہ سوار کا گھوڑا چنے چنے کی گھاس چرتا پھرتا ہے اور ریڑھے کے ٹٹو کے منہ پر تو بس توبڑا لٹکا ہوتا ہے، اسی میں منہ چلاتا رہتا ہے۔ کبھی اس توبڑے سے گھبرا کر وہ اپنی گردن جھٹکا دیتا بھی ہے تو یہ توبڑا پلٹ کر پھر اسی کی تھوتھنی میں آکر لگتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ظ انصاری اتنے سارے اخباروں سے رسی تڑا تڑا کر نہ بھاگتے۔ روزانہ اخبار میں دو چیزیں شاید سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں، اداریہ اور خصوصی کالم۔ روزانہ اخبار کا اداریہ لکھنا زیادہ تر مصرعِ طرح پر غزل کہنے کے مترادف ہے جب کہ خصوصی کالم میں پھر اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ صحافی اپنی جولانیِ طبع اور اپنے قلم کی گل کاریوں کا مظاہرہ کرے۔

'کانوں کی زبان' کے مندرجات میں اداریوں سے پہلے جو کچھ غیر طرحی ہے وہ بڑی حد تک مفید، معلوماتی اور دل چسپ ہے۔ ویسے اُردو صحافت کے طالب علم کے لیے یہ پوری کی پوری کتاب مفید ثابت ہوسکتی ہے جس طرح نومشق صحافیوں کے لیے یہ اداریے مشعلِ راہ ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان اداریوں میں کلبلاتے ہوئے شوخ و ش

ظ انصاری کو وہ صحافت کے پرچے کا لازمی سوال سمجھ کر پریشان نہ ہو جائیں۔

آج سے لگ بھگ پینتیس سال پہلے جب 'مجموعۂ خیال' ابھی 'فرد فرد' تھا تو ظ انصاری نے 'ورق ورق' لکھی جسے پڑھ کر ہمارے ایک دوست 'عرق عرق' ہوگئے تھے۔ اس کے بعد ان کے اہم ادبی کارناموں میں 'غالب شناسی'، 'خسرو کا ذہنی سفر' اور 'پشکن' جیسی چیزیں سامنے آئیں اور ساتھ ساتھ پاسبانِ عقل کی طرح صحافت بھی چلتی رہی۔ وہ قلم کے ماہر ہیں اور الفاظ کو کٹھ پتلی کا ناچ نچانا جانتے ہیں بلکہ آج کی اصطلاح میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے اندر سے پھوٹا ہوا لفظ اسپائڈر مین جیسا لگتا ہے۔ لیکن ان کی تمام تحریروں سے گزرنے کے بعد جب ہم 'کانٹوں کی زبان' کے اداریوں تک پہنچتے ہیں تو یہ اختری بائی فیض آبادی کے گھسے ہوئے ریکارڈ جیسے لگتے ہیں جو اختری بائی کے تو ہیں لیکن گھسے ہوئے ریکارڈ پر سوئی رگڑتے رہنے سے سوئی کی نوک تیز نہیں ہوتی اور کھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس سوئی کو ریکارڈ کے چلّے کے بجائے سان کے چلّے پر رگڑنے کی ضرورت ہے۔ خسرو، غالب، پشکن اور برنارڈ شا کی سان پر اس لیے کہ ابھی اس سوئی کی نوک میں تیکھے پن کی گنجائش ہے۔ ظ انصاری اس بات کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمیں اس چیز سے اپنی طاقت کا لوہا منوانے میں زیادہ لطف آتا ہے جس کی ہیبت ہم پر طاری ہو۔ غالب پر قلم اٹھاتے ہوئے کتنی بار ان کے پسینے چھوٹے ہوں گے، خسرو کے ذہنی سفر کی تلاش میں انھیں پٹرول کی دریافت کا سا جوکھم اٹھانا پڑا ہوگا۔ جہاں تک اخبار کے اداریوں کا تعلق ہے، وہ تو ایک ہاتھ سے لکھے جاتے ہیں دوسرا ہاتھ بہ یک وقت چائے کی پیالی اور سگرٹ کے عمل میں مشغول رہتا ہے اور بسا اوقات جس وقت آپ اداریے کی آخری سطور رقم کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کا تین چوتھائی اداریہ کتابت کی منزل بھی طے کر چکا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ظ انصاری جیسے لوگوں

نے اردو صحافت کو بہت کچھ دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ صحافت نے انھیں کیا دیا۔ اس پر فی الحال سوالیہ نشان لگاتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

ظ انصاری نے صحافت کے تعلق سے ایسی بہت سی عمدہ تحریریں ماہناموں، ہفت روز اخباروں اور روزناموں میں لکھی ہیں جن پر ان کا نام درج نہیں تھا لیکن ان کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ ظ انصاری کی تحریریں ہیں۔ 'کانٹوں کی زبان' ان کا وہ صحافتی کارنامہ ہے جو ان کے نام سے چھپ کر سامنے آیا ہے۔ اگر کبھی ظ انصاری کو ان کی تصانیف میں تولنے کی ضرورت پیش آئی اور خدا کرے وہ دن جلد آئے تو یقیناً 'کانٹوں کی زبان' بھی ترازو کے پلے میں دوسری کتابوں کے ساتھ رکھی ہوئی، شہد کی شیشیوں کے بیچ سرکے کی بوتل کی طرح۔

❁❁❁

مہر و محبت تمام

بسمل سعیدی

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں عربک اسکول کا طالب علم تھا۔ شعروشاعری کا ذوق تو شاید اس وقت مجھ میں پوری طرح نہیں پیدا ہوا تھا، ہاں اس میں دلچسپی خوب لیا کرتا تھا۔ نئے اور پرانے رسائل کے حصۂ نظم کا مطالعہ اور غزلوں کو اپنی بے سُری آواز میں گا گا کر پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ شاید وہ زمانہ تھا، جب دلّی کی تہذیبی زندگی پر مشاعرے اور مشاعروں پر ترنم بری طرح حاوی تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی شاعری کا شوق چرایا اور میں نے اوٹ پٹانگ شعر کہنے شروع کردیے۔ میرے یہ اشعار نہ صرف بحر سے خارج ہوتے تھے، بلکہ وزن اور بحر کا کوئی تصور ان کی تخلیق میں سرے سے شامل ہی نہیں تھا۔ قافیہ کی تمیز بھی برائے نام ہی تھی البتہ ردیف کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا۔ جب میں یہ شعر اپنی رف کاپی سے فیر کاپی میں نقل کرتا تو طویل مصرعوں کے الفاظ کو گھٹا کر اور چھوٹے مصرعوں کے حروف کو کشش دے کر اس طرح لکھتا کہ بظاہر دونوں مصرعے برابر کے نظر آئیں اور یہ عمل اس وقت میرے نزدیک گویا شعر کو نوک پلک سے درست کرنے کے مترادف تھا۔ ہمارے اسکول میں اس وقت اُردو کے ایک اُستاد تھے جو شاعر بھی تھے

لیکن اُستاد اور شاعر دونوں سے زیادہ وہ مولوی لگتے تھے۔ لمبا چوڑا قد، گھنی سیاہ داڑھی، ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک، ڈھیلی ڈھالی شیروانی جس کے بٹن آگے سے ہمیشہ کھلے ہوتے، ڈھیلی موری کا لٹھے کا پاجامہ، روزے نماز کے پابند۔ اسکول میں وہ اُردو کے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ دینیات کے ممتحن بھی ہوا کرتے تھے، ان بزرگ کا نام تھا رہبر پرتاپ گڑھی ـــــ اور بہت سی باتوں کے ساتھ میرے کانوں میں کسی کی کہی ہوئی یہ بات بھی کہیں سے پڑی ہوئی تھی کہ ''جائے استاد خالیست''، چنانچہ میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ اپنا کلام رہبر صاحب کو دکھا لیا کروں۔ شاید اس کی ضرورت مجھے یوں بھی محسوس ہوئی تھی کہ ایک دو مرتبہ 'جمالستان'، 'پارس'، 'چترا' اور 'آریہ ورت' جیسے پرچوں سے میرا بھیجا ہوا کلام واپس آچکا تھا۔ میں اپنے کلام کی ایک دستے کی فیر کاپی کو لے کر رہبر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ قبلہ مجھے شعر' لکھنے' کا شوق ہے۔ آپ میرے اُستاد ہیں، اگر کلام پر بھی اصلاح کردیا کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ یہ کہیں گے کہ تم اپنی کاپی چھوڑ جاؤ، میں دیکھ کر بتادوں گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انھوں نے مجھ سے کاپی سے چیدہ چیدہ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ ایک دو اشعار سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ صاحبزادے باتیں تو شاعرانہ کرلیتے ہو مگر شاعری نہیں کرپاتے۔ شعر میں ایک چیز وزن بھی ہوتی ہے، اسی وزن کی بنا پر نظم اور نثر میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ شعر کے ضمن میں وزن کا لفظ میں پہلی بار سن رہا تھا اس لیے باوجود کوشش کے میں وزن کا تصور اپنے دماغ میں نہیں بٹھا سکا۔ جب میں نے رہبر صاحب سے 'وزن' کی وضاحت چاہی تو انھوں نے ایک مصرعے کی تقطیع میرے سامنے اس طرح کی:

بشر رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

بشر راز / دلی کہہ کر / ذلیل و خوا / رہوتا ہے

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

جس وقت رہبر صاحب نے تقطیع مکمل کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے رگ کے رگ و ریشے میں موزونیٔ طبع سرایت کرگئی ہو۔ میں آج تک بھی عروض سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہر قسم کے ارکان کی صحیح تقطیع کرسکتا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے، اس روز سے آج تک لگ بھگ تمام رائج بحروں میں خود کو موزوں طبع پاتا ہوں۔

ملک اگرچہ تقسیم ہوچکا تھا لیکن دلی کی بساطِ ادب ابھی اجڑی نہیں تھی بلکہ پاکستان سے آئے ہوئے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اور سماں باندھ دیا تھا۔ وہ لوگ جن کا کلام کبھی ہم نے پرائمری اسکول کے نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا اور جو ہمیں شاعری کی دنیا کے اللہ میاں جیسے لگتے تھے، جو نہ جانے کہاں سے بیٹھے بیٹھے اپنا کلام نصاب کی کتابوں میں بھیج رہے تھے، اب ہمیں اُردو بازار میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مجھے یاد ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ منشی تلوک چند محروم کو دیکھا تھا تو کتنا حیران اور ششدر ہوا تھا۔ دلّی میں اُن دنوں مشاعروں کا بازار گرم تھا۔ شاید کوئی طرحی مشاعرہ تھا، اس میں بسمؔل شاہجہانپوری کی ایک غزل جس میں بے شمار مطلع ہی مطلع تھے، مشاعرے کی پبلک میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ کچھ تو اس لیے کہ غزل کی زمین جاندار تھی اور کچھ اس لیے کہ بسمؔل شاہجہانپوری صاحب کا ترنم بڑا قاتل تھا۔ اور کلام تو اس زمانے کے مذاق و معیار کے مطابق جیسا تھا، ویسا ہی تھا۔ غزل کا پہلا مطلع یہ تھا:

سبو بر دوش مینا در بغل مستانہ وار آئے

بقدرِ ظرف پی کرے کدے سے بادہ خوار آئے

بسمؔل شاہجہانپوری صاحب اپنی اس غزل کے ساتھ دلّی کے مشاعروں میں اس قدر مقبول

ہوئے کہ میرے دماغ میں بسمؔل کے معنی صرف بسمؔل شاہجہانپوری ہوکر رہ گئے۔ انھی دنوں دلّی کے روزانہ اخبار 'تیج' کا ایک سلور جوبلی نمبر شائع ہوا جو رسالے کی شکل میں تھا۔ ہمارے ہاں اُردو کا اخبار تیج آیا کرتا تھا چنانچہ اخبار والا وہ سلور جوبلی نمبر بھی ڈال گیا۔ میرے خوب مزے آئے اور میں نے اس رسالے کے حصۂ نظم کو مزے لے لے کر چاٹنا شروع کردیا۔ اس رسالے میں مجھے بسمل نام کے کئی شاعر نظر آئے۔ بسمؔل الہ آبادی اور نہ جانے کون کون، شاید بسمؔل سعیدی بھی تھے لیکن مجھے یہ سب بسمل بسمؔل شاہجہانپوری کے مقابلے میں نقلی نظر آئے — اس کے بعد ایک مرتبہ ریڈیو سے کوئی مشاعرہ نشر ہورہا تھا، اس میں جب بسمؔل سعیدی صاحب نے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا تو میں سخت بے لطف ہوا، ان میں بسمل والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اوّل تو وہ کلام تحت میں پڑھ رہے تھے اور پھر کلام اتنا مشکل کہ کچھ پلّے نہ پڑے، لیکن جوں جوں میں بڑا ہوتا جارہا تھا اور دلّی کی ادبی زندگی میں میری دلچسپیاں بڑھتی جارہی تھیں، یہ نام، بسمل سعیدی بھی بار بار میرے سامنے گھوم پھر کر آتا تھا۔ بسمل کا 'شاہجہانپوری' اب رفتہ رفتہ اور غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں 'سعیدی' بنتا جارہا تھا۔ انھیں ابھی تک میں نے دیکھا نہیں تھا اس لیے میں جب کبھی بھی ان کی شکل کا تصور کرنے کی کوشش کرتا تو ذہنی شکل تو نہ بنا پاتا تھا لیکن ہاں تصور میں ایک گھنی داڑھی ضرور براتی سی نظر آتی تھی۔ شاید یہ وہی داڑھی تھی جسے میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے بسمؔل کے چہرے پر لہراتے دیکھا تھا یعنی بسمؔل شاہجہانپوری کے چہرے پر۔

اس دوران میں رہبر صاحب عربک اسکول کو خیرباد کہہ کر پرتاپ گڑھ واپس جاچکے تھے۔ کچھ دن انھوں نے بذریعۂ ڈاک میرے کلام کی اصلاح کی، پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے بھی شعر کہنا چھوڑ دیا اور اس دور کا کلام بھی دست بردِ زمانہ

کی نذر ہوگیا۔ میں اُس کلام کو اب مشقِ سخن پر محمول کرتا ہوں لیکن میری طبع موزوں رہبر صاحب کا سب سے بڑا ورثہ ہے۔

دلّی کے اُردو بازار میں جہاں آج کل کیفی لائبریری ہے، اس کے نیچے ایک چائے خانہ ہوا کرتا تھا جس کا نام تھا 'تاج ہوٹل'، ہم اکثر یہاں چائے پینے جایا کرتے تھے۔ اس ہوٹل میں میں نے پہلی مرتبہ ظ انصاری کو دیکھا جو اس زمانے میں 'شاہراہ' کے مدیر تھے۔ یہیں انور عظیم، مخمور جالندھری، فکر تونسوی اور پرکاش پنڈت کی چوکڑی بھی جمتی تھی جو یا تو 'شاہراہ' کے دفتر سے آرہے ہوتے تھے یا وہاں جانے والے ہوتے تھے۔ کبھی کبھار میں نے یہاں غلام ربانی تاباں صاحب کو بھی دیکھا جو باوجود اپنے کھچڑی بالوں کے سیاہ چشمے میں خوبصورت نظر آتے تھے (اب تو ان کے بقیہ سفید بال بھی کالے ہوگئے ہیں) اس ہوٹل میں ایک لمبا چوڑا خوبصورت مگر بے ڈھب سا لڑکا منیجر کے فرائض انجام دیا کرتا تھا جو بل کاٹنے کے وقت کو چھوڑ کر بقیہ تمام وقت گنگناتا رہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب شاعر ہیں۔ بے چارے پر بڑا رحم آیا اور اس کے ساتھ ہی ہوٹل کا مستقبل بھی کچھ تاریک نظر آنے لگا۔ اس ہوٹل میں خاصی خاصی دیر ایک دراز قد اور چھریرے بدن کے صاحب کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نظر آتے تھے۔ تاج ہوٹل کے منیجر سے ان کی بات چیت زیادہ ہوتی تھی۔ ایک دن وہ کسی سلسلے میں جوش صاحب کا ذکر کررہے تھے کہ خلیق انجم نے اچانک دریافت کیا، یہ صاحب بسمل سعیدی ہیں۔ اس دن سے میں نے بسمل صاحب کی باتوں میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ ہم تقریباً روز یہاں آتے تھے اور بسمل صاحب بھی ہمیں تقریباً روز ہی یہاں بیٹھے ہوئے ملتے۔ رفتہ رفتہ پھر یوں ہوا کہ میں بسمل سعیدی کو ہی اصل بسمل سمجھنے لگا لیکن ابھی تک میری بسمل صاحب سے دور کی ہی ملاقات تھی، مجھے ان سے ہم کلام ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔

چار پانچ سال بعد شعر کہنے کی ترنگ پھر آئی۔ میں نے ابھی ایک ہی غزل کہی تھی کہ اچانک دلّی سے ہفت روزہ 'آئینہ' جاری ہوا اور مجھے اس میں چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ 'آئینہ' کے اسٹاف میں ایک طرف سے ظ انصاری اور دوسری طرف سے بسمل سعیدی صاحب بھی آجڑے۔ یہی وہ موقع تھا جب پہلی بار بسمل صاحب سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

'آئینہ' میں بسمل صاحب کا کام اشاعت کے لیے آئی ہوئی منظوم تخلیقات کو دیکھنا تھا۔ 'آئینہ' ایک سال جاری رہا، اس ایک سال کے عرصے میں بسمل صاحب کے ساتھ جو وقت گزرا وہ یاد رہے گا۔ کبھی کبھی 'آئینہ' کے دفتر میں تاج ہوٹل کا نوجوان منیجر بھی بسمل صاحب سے ملنے آتا تھا، یہ نوجوان مخمور سعیدی تھا۔ میں نے بسمل صاحب کو اپنے شعر دکھانے شروع کردیے اور انھوں نے بھی یہ کام بخوشی اپنے ذمہ لے لیا۔ میں نے بسمل صاحب کے آگے باقاعدہ طور پر زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور شاید ان کے کسی بھی شاگرد نے ایسا نہیں کیا۔ بسمل صاحب خود بھی کبھی اس کے خواہاں نہیں رہے۔ وہ کلام پر اصلاح اُستاد کی طرح نہیں بلکہ مشیر کی طرح دیتے ہیں اور نہ تعلقات کو محض اصلاحِ شعر تک محدود رکھتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ وہ دوستی اور رفاقت بھی چاہتے ہیں۔ جتنا وقت بھی ان کے ساتھ گزرے، وہ برابر کسی نہ کسی عنوان سے مستفیض کرتے رہتے ہیں۔ بسمل صاحب کا اصلاحِ شعر کا طریقہ بھی انوکھا ہے۔ بسمل صاحب کی اصلاح سے نہ آپ کے شعر کا مفہوم بدلتا ہے نہ آپ کا انفرادی اندازِ بیان، وہ تو صرف اپنے تجربے اور مشاقی کی مدد سے آپ کے ہاں مشقِ سخن کی جو کمی رہ گئی ہو، اسے پورا کردیا کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح بڑی برجستہ اور انتہائی غیر معمولی طریقہ پر معمولی یا مختصر ہوا کرتی ہے اور اس میں وہ شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ بعض اوقات محض ایک لفظ کے ردوبدل سے شعر کو

کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ انھیں خاص تعلق ہے، ان کی تربیت کو وہ ہر وقت پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آپ ان کے سامنے نظم پڑھیے یا نثر، ان کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کیجیے یا بے تکلف باتیں، وہ اپنا علم آپ کے سینے میں اتارنے سے چوکتے نہیں۔ انھیں جو کچھ بھی معلوم ہے (اور میں اندازہ نہیں کرسکتا کہ انھیں کتنا معلوم ہے)، اسے وہ بے دریغ احباب میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ بسمل صاحب ایک بے تکلف دوست بھی ہیں۔ دوستی میں ان کے ہاں عمر کی قید نہیں ہے۔ استادی اور شاگردی کے رشتے کو بھی وہ دوستی کی ہوا سے محفوظ نہیں رکھتے۔ بے تکلف مذاق، ہزلیہ اشعار، ہر چیز کو لطف کے ساتھ سنتے بھی ہیں اور سناتے بھی ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص کے ساتھ حفظ مراتب سے پیش آنا ان کی وضع ہے۔ تعارف کے معاملے میں وہ کسی وضع دار انگریز سے کم نہیں۔ جن لوگوں سے متعارف نہ ہوں، نہ ان کی باتوں میں دخل دیتے ہیں نہ اپنی گفتگو میں ان کا دخل گوارا کرتے ہیں۔ انھیں کم شعر پسند آتے ہیں لیکن وضع داری کا تقاضہ یہ ہے کہ محفلوں میں معمولی معمولی شعروں کی داد گھٹیا سامعین سے بھی بڑھ کر دیں گے۔ مشاعروں میں میں نے دیکھا ہے کہ اکثر بسمل صاحب کو ان کے مرتبہ کی بنا پر بالکل آخر میں پڑھوایا جاتا ہے۔ آج کل مشاعروں کا رنگ یہ ہے کہ جس وقت مشاعرہ عین شباب پر ہو، اس وقت ہر شاعر یہ چاہتا ہے کہ اسے پڑھوا دیا جائے اور لطف یہ کہ لوگ پڑھ پڑھ کر رخصت ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے بسمل صاحب کو کئی مشاعروں میں اس وقت پڑھتے دیکھا ہے جب اسٹیج پر صاحبِ صدر اور میر مشاعرہ کے علاوہ صرف بسمل صاحب باقی رہ گئے ہوں لیکن اس کے باوجود کبھی بسمل صاحب کی تیوری پر بل نظر نہیں آئے، انھیں کبھی اسٹیج پر بیٹھ کر منتظمین مشاعرہ سے شکایت کرتے نہیں دیکھا گیا۔

بسمل صاحب نے یوں تو بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں لیکن ایک بات بڑی

کانٹے کی ہے اور اس کا ذکر میں بسمل صاحب کے سلسلے میں بار بار کر چکا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے تین میم ضروری ہیں۔ پہلا میم ہے مطالعہ، دوسرا میم مشق اور تیسرا مشورہ۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ پہلے اور دوسرے میم کی پابندی کے لیے کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں لیکن مشورے کے لیے اپنے علاوہ دوسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ وہ مشورے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ نہیں ہے کہ مشورہ انھیں سے لیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں اسے منظرِ عام پر لانے سے قبل اپنے کسی سخن فہم دوست یا ساتھی کو بھی دکھا لینا انتہائی ضروری ہے، بسا اوقات تخلیق کے جوش میں بعض ایسی اغلاط بھی سرزد ہو سکتی ہیں جن کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بہت سارے لوگوں کے سامنے شرمندگی اٹھانے سے کہیں بہتر ہے کہ دائی کو پیٹ دکھا لیا جائے۔

بسمل صاحب بعض معاملات میں بہت بدنصیب واقع ہوئے ہیں۔ کچھ معاملات تو اس قدر رنجی ہیں کہ ان کا ذکر ہی یہاں بے جا ہے لیکن بعض باتیں یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ بسمل صاحب سے ان گنت لوگوں نے استفادہ کیا ہوگا لیکن محض معدودے چند لوگ ہی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے بسمل صاحب سے کچھ حاصل کیا ہے۔ بعض لوگوں کا شعار میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی تازہ چیز کہیں گے تو سیدھے بھاگے ہوئے اُردو بازار آئیں گے اور بسمل صاحب کو لے کر چپکے سے کسی ایسے چائے خانے میں جا کر بیٹھیں گے جہاں عام طور پر ادیب اور شاعر نہیں جاتے۔ وہاں گھنٹہ بھر تک خوب بسمل صاحب کا دماغ چاٹیں گے۔ یہ لوگ اس شام بسمل صاحب کو چائے کے ساتھ ٹوسٹ اور مکھن بھی پیش کریں گے اور بسمل صاحب تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ان کی صحبت کے زہر کے ساتھ ٹوسٹ اور مکھن کو بھی حلق سے اتارتے چلے جائیں گے لیکن ایسے لوگوں سے ان کو جو تکدر ہوا کرتا ہے، اس کی بجز اس وہ کچھ گنے چنے لوگوں کے ساتھ بیٹھ

کر نکال لیا کرتے ہیں۔

میں نے بسملؔ صاحب کے کلام کو خوب پڑھا ہے، ان کے بے شمار اشعار مجھے یاد ہیں۔ وہ جس درو بست کے ساتھ شعر کہتے ہیں، وہ ان کے کلام میں اتنا نمایاں ہے کہ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، وہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کی کلاسیکی روایات کو خوب اچھی طرح پچایا ہے، زبان کی نزاکتوں کو پوری طرح سمجھا ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزلیات پر مبنی ہے۔ انھوں نے تنگنائے غزل کو اپنے مخصوص شعری رویّے کی بنا پر اور بھی تنگ کرلیا ہے جو شاید سہلِ ممتنع سے بھی زیادہ دشوار گزار راستہ ہے۔ میری مراد ان کے ان مخصوص اشعار سے ہے جن کے نمونے کے طور پر یہ ایک شعر حاضر ہے:

سر جس پہ نہ جھک جائیں اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

جس طرح آدم نے خود اپنی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا کر کے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھایا، ٹھیک اسی طرح بسملؔ صاحب بھی اس طرح کے بے شمار اشعار میں پہلے مصرعے کی بائیں پسلی سے دوسرے مصرعے کو تخلیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بسملؔ صاحب کے اس طرح کے اشعار کی مثال حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے بھی دی جاسکتی ہے جس میں فنکار نے ایک ہی پتھر میں ایک طرف غرور اور دوسری طرف عجز کے دو مجسموں کو اس طرح تراشا ہے کہ آگے والے مجسمے کی تمکنت اور اکڑ ہی سے پیچھے تراشے گئے مجسمے کے جھکاؤ کا کام لیا گیا ہے۔

بسملؔ صاحب کے بے شمار اشعار مجھے ازبر ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان میں سے وہ شعر جو مجھے بہت پسند ہیں یہاں درج کروں لیکن ان کی تعداد بھی اتنی ہو جائے گی کہ

شاید کئی صفحے گھیر لیں، اس لیے ان میں سے صرف ایک شعر سنا کر رخصت ہوتا ہوں:

یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے
اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری

❁❁❁

خواجہ غلامُ السّیّدین

خواجہ غلامُ السّیدین کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ آج ۲۰۰۴ء میں ہم ان کی ولادت کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ سیدین ایک دانش ور اور ماہرِ تعلیم ہی نہیں، وہ ایک صالح اور انتہائی شائستہ انسان بھی تھے۔ ان کی شائستگی ارسٹوکریسی یا جاگیردارانہ قسم کی تہذیبی ریاکاری سے نہیں بلکہ اس انسانی رویّے سے عبارت تھی جو زندگی گزارنے کے لیے پیغمبروں، اوتاروں، ولیوں، رشیوں منیوں اور درویشوں کے نقشِ قدم تلاش کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ سیدین ایک انتہائی دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ ایک مذہبی انسان بھی تھے۔ اگرچہ ان کی مذہبیت کا خصوصی حوالہ مذہب اسلام ہی تھا لیکن وہ کسی قسم کی مذہبی عصبیت سے کوسوں دور تھے۔ مذہب ان کے لیے ایک عقیدہ ہی نہیں، ادراک (phenomenon) بھی تھا اور ادراک کسی ایک یا دوسرے مذہب یا عقیدے سے آگے کی وہ منزل ہے جو انسان کو مذہب کی اصلی اسپرٹ سے ہم کنار کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے دل میں تمام مذاہب کا یکساں احترام تھا۔ سچ اور حق کی تلاش ہی ان کی زندگی کا مشن تھا، جس کے بارے میں انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں اور اپنے قول و عمل

کے ذریعے زبان، زندگی، تعلیم، سماج اور حیات و کائنات کے جملہ مسائل و معاملات کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک ایسی شخصیت کو یاد کرنے کے معنی ہماری نظر میں یہ ہونے چاہییں کہ ہم اپنے آپ کو ان کی زندگی اور ان کے علمی کارناموں کی بازیافت کے عمل میں مصروف کردیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ سیدین کے انتقال کے بعد سے لے کر اب تک تعلیم کے میدان میں، جو ان کی دلچسپی کا خاص شعبہ تھی، کیا تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں، تعلیم کو آج جن چیزوں کا سامنا ہے پچھلی نصف صدی سے ہمارے دانش وروں کا ردِ عمل اس پر کیا رہا ہے۔

خواجہ غلامُ السّیدین کے افکار و نظریات تحریری شکل میں ہمارے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کے بالاستیعاب مطالعے سے قاری کے ذہن پر ان کی فکر کے تمام گوشے روشن ہوسکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں سرسید تحریک اور اُردو ادب کے نشاۃ الثانیہ کے نتیجے میں لوح و قلم کی جو کھیتی پھلی پھولی اس کا انتظار اُردو زبان اور بالخصوص اُردو نثر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے زمانے سے لے کر مرزا رجب علی بیگ سرور کے عہد تک کرتی رہی ہے۔ اگر حالؔی اور ان کے چند ہم عصروں کو نشاۃ الثانیہ اور مابعد نشاۃ الثانیہ کے ادوار کی درمیانی کڑی مان لیا جائے تو حالؔی، خواجہ غلامُ السّیدین کا ماضی قریب اور خواجہ غلامُ السّیدین، حالؔی کا مستقبل قریب قرار پاتے ہیں۔ گویا حالؔی، خواجہ غلامُ السّیدین کے مقدم ہم عصر (early contemporary) اور خواجہ غلامُ السّیدین، حالؔی کے موخر ہم عصر (later contemporary) ہیں، بالخصوص حالؔی کی بوباس سیدین میں ہونا یوں بھی فطری سی بات ہے کہ وہ حالؔی کا خون تھے۔ حالؔی کے رگ و پے میں ان کی تمام تر مرنجاں مرنجی اور منکسر المزاجی کے باوجود اجتہاد اور احتجاج موجِ خوں بن کر دوڑتا تھا اور یہی معاملہ خواجہ غلامُ السّیدین کا بھی تھا۔ زبان کے غلط، ناروا اور مجرمانہ استعمال (language

abuse) پر جیسی تشویش کا اظہار سیدین نے کیا ہے ایسا شاید ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ ان کی تشویش اس لیے بھی بجا تھی کہ زبان ہی بالآخر وسیلہ ہے ان تمام چیزوں تک پہنچنے کا، جن کے ذریعے ہم دنیا کو بہتر شکل دینے اور اور بلاتفریق ہر شخص کے رہنے کے قابل دیکھنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ سیدین کے نزدیک تعلیم ہی صحیح معنوں میں وہ مشعل ہے جسے ہاتھ میں لے کر ہم اپنے آدرشوں کے راستے کے دھندلکوں کو صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ 'تعلیم' سیدین کے لیے نہ تو صرف لغت کا ایک لفظ ہے اور نہ یہ محض حرف شناسی کا نام ہے۔ تعلیم کے معنی سب سے پہلے تو یہی ہیں کہ ہم تعلیم کے مقصد کو ذہن نشین کریں۔ ہر زمانے کا سماج مختلف قسم کے غلط عناصر اور رویوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ان عناصر اور رویوں کی شناخت اور ان سے بچ کر نکلنے کی راہ نکالنا تعلیم کی سب سے پہلی مہم ہے۔ اگر تعلیم کو حق کا علم بردار مان لیا جائے جو وہ فی الواقع ہے تو ہمیں یہ بھی مان کر چلنا ہوگا کہ یہ علم ہمہ وقت حق و باطل کی جنگ میں اپنے آپ کو مبتلا رکھتا ہے۔ یہ لڑائی ایک زمانے تک اندرونی تھی اور اب یہ اندرونی کے ساتھ بیرونی بھی ہوتی جارہی ہے۔ اس لڑائی کی طرف ہمارے ایک اور ماہر تعلیم سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ایس. رادھا کرشنن نے بھی جگہ جگہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں واضح اشارے کیے ہیں اور ان قوتوں سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے جو داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ہم پر وار کرنے کی گھات میں رہتی ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن، خواجہ غلام السّیدین کے ہم عصر تھے اور یہ دونوں ہی ہم عصر اپنے عہد کے خطرات سے پوری طرح باخبر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں یونیسکو (UNESCO) گول میز کانفرنس کے اپنے افتتاحی خطبے میں انھوں نے بعض اہم معاملات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"سماجی علوم کا مطالعہ ہمیں کس حد تک انسانی ترقی کے مقصد کے قریب

تر لے آئے گا، ایسا ہر اس اضافے کے بعد لازمی ہے جو ہمارے علم میں ہوتا ہے۔ لیکن انسانی ترقی اور دنیا کی مخلوق کے ساتھ مل کر رہنے کا مقصد (اپنی تکمیل کے لیے) سماجی اور سائنسی علوم کے علاوہ کچھ اور چیزوں کا بھی طلب گار ہے۔ وہ شعبے جو اخلاقی، فلسفیانہ اور مذہبی اقدار سے واسطہ رکھتے ہیں، اچھی زندگی کے آدرشوں اور عالمی برادری کے تصور کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہیں۔

زرعی، سائنسی اور صنعتی مہارتیں ہماری پیداواری صلاحیتوں کو فروغ دے سکتی ہیں لیکن وہ ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ ہم اپنی بڑھی ہوئی دولت اور آسائش کا کیا کریں۔ اقتصادیات، سیاست اور علم قوانین جیسے قانون تو وضع کر سکتے ہیں اور بنیادی حقوق کی تعبیرات بھی بیان کر سکتے ہیں لیکن وہ بجائے خود اچھے سماج کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کے ہاں سماجی علوم کی آگہی جو غیر متعین (chaotic) اقدار کے حامل ہوں، ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ سائنسی علوم نے حال ہی میں جو شاندار ترقی کی ہے، اس نے یہ تاثر پیش کیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی اپنی تیز رفتار ترقی کی بدولت خود بہ خود انسانی ترقی کی محافظ ہوگئی ہے۔ یہ نظریہ دو عالمی جنگوں کے تجربوں سے گزرنے کے بعد چکنا چور ہوگیا۔ اس سے پہلے کبھی بھی نہ تو سائنسی ترقی اتنی عام اور شدید ہوئی تھی اور نہ ہی ناروا داری نے اتنی وحشیانہ شکل اختیار کی تھی اور نہ تہذیب و تمدن ایسے شیشے کا گھر ہوکر رہ گئے تھے۔"

(Occasional speeches and writings, S. Radha Krishnan,

Publications Division,p.96)

اپنے اسی خطبے میں خصوصاً سماجی علوم کے تعلق سے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے آگے چل کر ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے:

> ''اگر ہم سماجی علوم کی آگہی کے ذریعے انسانی ترقی اور عالمی مخلوق کی کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں انسانی فطرت کی تربیت کے لیے جمالیات، اخلاقیات، فلسفہ اور مذہب کے شعبوں سے رجوع کرنا ہوگا حال آں کہ یہ شعبے سماجی علوم کی مطلق تعریف (absolute definition) کے دائرے میں نہیں آتے۔ علوم خواہ وہ سائنسی ہوں یا سماجی، وہ ہمیں آگہی بہم پہنچاتے ہیں عقلِ سلیم (judgement) نہیں، اقدار ودیعت کرتے ہیں نظر نہیں، طاقت مہیا کرتے ہیں منظوری نہیں''۔
>
> (ibid, p. 98)

خواجہ غلام السیدین کے انتقال سے چھ سال قبل ۱۹۶۰ء کے دہے میں مغرب سے اٹھتی ہوئی اس آگ کا دھواں یہاں تک پہنچنا شروع ہوا، جس میں ایک طرف establishment کے خلاف بغاوت کی بو تھی تو دوسری طرف اس میں ایک باضابطہ محفوظ، منضبط، غیر متبدل اور یک رنگ قسم کی stereotype زندگی کی گھٹن کے احساس کی کھنکار تھی۔ اس بغاوت میں مغرب کا نوجوان طبقہ اور ادیب شاعر اور بہت سے سیاسی اور سماجی مفکر بھی شامل تھے۔ اس صورتِ حال سے جرمن نژاد امریکی مفکر ہربرٹ مارکوزے (Herbert Marcuse) نے One Dimensional Man یعنی یک رخے آدمی کا تصور پیش کیا۔ یہ establishment کا وفادار وہ آدمی تھا جو اپنی اس دھج سے بے خبر تھا

کہ وہ یک رخا آدمی ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسری طرف establishment سے بغاوت کرنے والوں میں بہت سے احساسِ تنہائی کے جنگلوں میں بھٹکنے کو نکل گئے۔ ادھر اُردو ادب میں بعض ترقی پسند ادیبوں کی یک رنگی کی دھند میں اس دھوئیں نے مل کر فضا میں ایک ایسا کہرا ابھر دیا جسے ماہرین موسمیات smog (smoke اور fog کا امتزاج) قرار دیتے ہیں۔ اسی smog کو ہم اُردو میں جدیدیت کا نام دیتے ہیں جس نے سرے سے ہر قسم کے نظامِ اقدار ہی کو ٹھکرا کر رکھ دیا۔ جدیدی فکر میں البتہ یک رخے انسان کے المیے اور احساسِ تنہائی کے جنگلوں میں بھٹکنے والے آدمی کے پاؤں کے چھالوں کی چبھن ضرور محسوس کی جا سکتی ہے۔ نظامِ تعلیم کو بھی ان حالات میں اب ایک نئے زاویۂ نظر کی ضرورت تھی لیکن فلسفیانہ فکر نے پہلے عصری صورت حال کی دانش ورانہ تعبیریں ڈھونڈنے کو ترجیح دی۔ اس رویے کو غلط یا صحیح قرار دینے کا یہاں کوئی محل نہیں۔ چناں چہ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والی ہربرٹ مارکوزے کی کتاب One Dimensional Man کے پہلے ہی ورق پر کتاب کا جو تعارف پیش کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے:

> ''ماؤزے تنگ، چی گوارا اور ہو چی من کے ساتھ ہربرٹ مارکوزے طالب علموں کی انقلابی تحریک کے پیغمبر کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی تھیسیس یہ ہے کہ موجودہ ٹکنالوجیکل سوسائٹی میں نام نہاد آزاد اداروں اور ڈیموکریٹک خود مختاریوں کا کام دراصل آزادی کو پابہ زنجیر کرنا، انفرادیت کا گلا گھونٹنا، استحصال کو خوش نما بنا کر پیش کرنا اور انسانی تجربے کو محدود کرنا ہے۔ سوسائٹی کو مفاد پرستوں کی جانب سے پیدا کی جانے والی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے جال میں پھنسا کر اسے اپنے کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔ آقاؤں اور مالکوں کے تسلط پر

انھیں جھوٹی شان و شوکت کے بیوروکریٹوں اور کارپوریشنوں کا درجہ دے کر نظر رکھی جاتی ہے۔ تنقید کرنے والوں کے احتجاجوں کو انسٹی ٹیوشنل ڈیموکریسی کے غیر ضرر رساں سیفٹی والو کے چینل میں ڈال کر انھیں موثر ڈھنگ سے خاموش کردیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس سے ایک نئی مطلق العنانیت وجود پذیر ہوتی ہے جس میں انقلابی قوت کی آخری کھونٹی وہ لوگ ہیں جو پیداواری عمل میں کسی طرح کے حصے دار نہیں۔ یعنی رنگ دار اقلیتیں، مستقل طور پر رہنے والے بے روزگار اور ان سے زیادہ غریب۔ اس طرح One Dimensional Man میں صرف جدید سوسائٹی ہی کی تنقید نہیں بلکہ وہ یہ متبادل بھی پیش کرتی ہے کہ کس طرح موجودہ طرزِ زندگی اور طرزِ فکر کو بدلا جاسکتا ہے۔ بات کا لب لباب یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے چیلنج بھی ہے اور رہ نما بھی جو ٹکنالوجیکل سوسائٹی کے حصار سے باہر آنا چاہتے ہیں۔"

خواجہ غلام السیدین کا انتقال دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ ہندوستان کے افق پر کمپیوٹر ابھی طلوع ہی ہوا چاہتا تھا۔ لیکن اکیسویں صدی کے آتے آتے معلوماتی ٹکنالوجی (information technology) جسے عرفِ عام میں .I.T کہا جاتا ہے، ہمارے ملک اور بلکہ ہماری زندگی میں وحشی حملہ آوروں (Barbarians) یا غیرملکیوں کی طرح اس طرح دندناتی ہوئی در آئی کہ اس نے تعلیم کو ملکیوں کی طرح ہمارے اکادمیہ (academia) سے کھدیڑنا شروع کردیا۔ یہ سلسلہ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔ یہ باتیں اگرچہ سیدین کے حاشیۂ خیال میں نہ بھی سہی لیکن انھیں سیدین کے نظامِ فکر کی اگلی کڑی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ 'سیکولر پرسپکٹو' (Secular Perspective) کے یکم

تا پندرہ اکتوبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں مشہور دانش ور، اسلامک اسکالر اور ریفارمسٹ بوہرہ لیڈر ڈاکٹر اصغر علی انجینیر کا ایک انگریزی مضمون 'تعلیم، سیکولرزم اور انسانی قدریں' (Education, Secularism and Human Values) شائع ہوا ہے جس میں خاص طور پر انھوں نے تعلیم پر انفارمیشن ٹکنالوجی کی سبقت پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون کے کچھ حصے یہاں پیش ہیں:

"دنیا میں تعلیم کے بغیر کسی بھی شخص کے لیے جینا بے حد مشکل ہے۔ اگر آج کوئی شخص ترقی کرنا اور اقتصادی طور پر خوش حال ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے اونچی سطح کی تعلیم حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ چناں چہ دورِ جدید میں تعلیم سچ کی تلاش اور زندگی کے معنی کی دریافت سے زیادہ اعلا اقتصادی درجہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہوکر رہ گئی ہے۔ آج تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود کو آگہی یعنی knowledge کے زیور سے آراستہ کرنے کے بجائے جسے کسی زمانے میں علم یا گیان کہا جاتا تھا، زیادہ تر معلومات (information) سے لیس کریں۔

عصرِ حاضر میں اگر انفارمیشن ٹکنالوجی نے اس درجہ اہمیت حاصل کرلی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ آج انفارمیشن ٹکنالوجی کو آگہی کے کارخانے یعنی knowledge industry کا نام بھی دیا جاتا ہے، گویا آگہی کو گھسیٹ کر معلومات کے درجے پر لے آیا گیا اور اس کی وقعت کو کم کرکے اسے ایک کارخانے کا نام دے دیا گیا جس کا کام نفع کمانا ہے۔ آج آگہی اس طرح اپنی حرمت کھو بیٹھی ہے اور اب یہ سچ کی تلاش کا نہیں بلکہ طلبِ زر کی تگ و دو کا نام ہوکر رہ گئی ہے۔ اب

آگہی مقصد نہیں ذریعہ ہے، ایک آلۂ کار ہے۔

مشہور امریکی فلسفی ہربرٹ مارکوزے نے کیا برجستہ بات کہی ہے کہ ہماری یونی ورسٹیاں اب آگہی کا منبع نہیں بلکہ صلہ پہنچانے (acknowledgement) کے مراکز ہوکر رہ گئی ہیں۔ گویا اب وہ علم و دانش (cognition) کے سرچشمے نہیں، قدر شناسی (recognition) کے ادارے ہیں۔ اب ان اداروں میں تحصیلِ علم اور آگہی کی کوئی قدر افزائی نہیں ہوتی، ملازمتوں کے لیے مقابلے کرانا ان کا مقصد ہے۔

آج تعلیم پر ایک طرف تو حکومت کا کنٹرول ہے اور دوسری طرف دولت مندوں کا۔ اور ان دونوں کے اپنے اپنے مقاصد اور اپنا اپنا ایجنڈا ہے۔ اگر ایک طرف حکومت اس کے ذریعے اپنے سیاسی نظریات کو فروغ دینا چاہتی ہے تو دوسری طرف دولت مند اس سے منفعت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملکوں میں حکومت ابھی تک تعلیم کے میدان کی سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔ کیا پڑھایا جانا ہے اس کا فیصلہ حکومت کرتی ہے اور اس کے اعتبار سے کتابیں داخلِ نصاب کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں تعلیم پر مرکز اور صوبوں دونوں سطح پر زیادہ تر سرکار ہی کا اختیار ہے۔ تعلیم کے معیار کے تعین میں سرکار کا رول انتہائی اہم ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے لیکن ہماری تعلیم، اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے اس سے کوسوں دور ہے۔ ہماری نصابی کتابیں پرائمری اور اعلا سطحوں پر فرقہ وارانہ طرزِ فکر سے بری طرح آلودہ ہیں۔ ہم اکثر

برطانوی حکمرانوں کو ان کی لڑاؤ اور حکومت کرو پالیسی کے لیے مورد الزام قرار دیتے ہیں لیکن ہماری نصابی کتابیں آج آزادی کے ۵۷ برس بعد بھی کچھ معتبر مستثنیات کو چھوڑ کر لوگوں میں نفاق پھیلانے کا رول انجام دیتی ہیں۔ سرکار کی یہ تعلیمی پالیسی فرقہ وارانہ اندازِ فکر کو فروغ نہیں دیتی یہ باقاعدہ طور پر فرقہ واریت کا بیج بوتی اور اقلیتوں کے خلاف منافرت پھیلاتی ہے۔

ہماری نصابی کتابیں اکثریتی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں اور ملک کی مشترکہ اور گنگا جمنی قدروں کو مستحکم کرنے کے معاملے میں ناکام ہیں۔

آج فرقہ وارانہ طرزِ معاشرت کا مقابلہ کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ مشترکہ تہذیب کو پوری قوت کے ساتھ فروغ دیا جائے۔

ہم بہت سے اسکولوں میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی شبیہیں ٹنگی دیکھتے ہیں اور دیواروں پر ایسے اشلوک آویزاں نظر آتے ہیں جن کا تعلق صرف ہندو دھرم کی مقدس کتابوں سے ہے۔ حال ہی میں میں نے ممبئی میونسپل کارپوریشن کے ایک اسکول کا دورہ کیا اور مجھے اس اسکول کا پورا ماحول ہندو مذہب کے رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیا۔ یہاں کسی اور مذہب کی کوئی نمائندگی دکھائی نہیں دی۔ انجیل، قرآن یا گروگرنتھ صاحب کا کوئی قول یہاں نظر نہیں آیا۔ اس صورتِ حال سے دوسرے فرقوں کے ان بچوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں جو یہاں خود کو مکمل طور پر اجنبی محسوس کرتے ہیں۔

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کے ذہنوں میں ایک

تنقیدی شعور کی نشوونما ہو۔ لیکن کوئی شمہ برابر بھی تعلیم کے اس مقصد کے آس پاس نہیں پہنچتا۔ ہمارے سارے ہی اسکول بچوں میں ایک دقیانوسی اور فکر سے عاری unthinking رویے کی افزائش کرتے ہیں۔ بچوں کی حوصلہ افزائی اس بارے میں کی جاتی ہے کہ وہ روایت کی پیروی کریں نہ کہ اپنے اندر تنقیدی پرکھ کی صلاحیت پیدا کریں۔ خود اساتذہ کا تعلق بھی ایک انتہائی قدامت پرست ماحول سے ہوتا ہے اور وہ یہی چیز اپنے طلبہ کو ودیعت کرتے ہیں، ان میں اکثر اساتذہ تو باقاعدہ تدریسی عمل کو بروئے کار بھی نہیں لاتے۔ وہ تو کلاس میں کھڑے ہو کر نصاب کا ورد کرتے ہیں تاکہ طلبہ امتحان پاس کرنے کے لیے بس اسے رٹ لیں۔

لاطینی امریکہ کے ماہر تعلیم فادر پال فریر (Paulo Freire) تو تعلیم کے اس تفاعلی طریقے (interactive method) پر زور دیتے ہیں جہاں طالب علم کو ایک ایک موضوع یا مضمون پر تبادلۂ خیال کرنے اور سوال اٹھانے کا موقع فراہم ہو۔ اس طریقۂ کار سے طالب علم کے سوچنے اور تنقید کرنے کی صلاحیت کو جلا حاصل ہوگی۔ ہمارے اساتذہ اپنے طالب علموں کے دماغ میں محض معلومات (information) بھر دینے کا کام انجام دیتے ہیں اور کسی بھی تنقیدی مباحثے کی قطعی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ تحصیل علم اصل معنی میں سچائی اور آگہی کی جستجو ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے اس طرح کے اکتساب علم کا کوئی سامان فراہم نہیں کرتے۔

جب بی۔ جے۔ پی۔ اقتدار میں آئی تو اس نے ہندو ماضی کو انتہائی قابل فخر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی اور مسلم ماضی کو بھوت پریت کا ہم پلہ قرار دیا۔ ماضی میں ایک مخصوص مذہب کے شان و شکوہ کے آثار دریافت کرنا اور دوسرے مذہب کو ماضی کی بنیاد پر مردود قرار دینا، یہ تاریخ نہیں بلکہ تاریخ کا مذاق ہے۔

ماضی ہو یا حال، انسانی سماج ہمیشہ تصادم اور تشدد کی آماجگاہ رہا ہے۔ مذہب کسی سماج کو اچھا یا برا نہیں بناتا ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تو خود بنی نوع انسان ہی ہے جو اپنے اپنے مفادات کی بنیاد پر خیر یا شر کو فروغ دیتا ہے۔ تاریخ میں کوئی عہد ایسا نہیں گزرا جو تصادم اور ٹکراؤ سے خالی رہا ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہ تو انسانی مفادات ہیں جو سماجی قوتوں کی سمت اور رفتار کا تعین کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے تاریخ کی تماشا گاہ میں مرکزی مقام مذہبی اقدار کو نہیں انسانی مفادات کو حاصل ہے۔

اگر ہمیں جدید ہندوستان کی تعمیر کرنی ہے تو اس کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی نظام کی مکمل اصلاح کرنی ہوگی۔ بدقسمتی سے کسی بھی حکومت نے خواہ اس کے دعوے کچھ بھی رہے ہوں، اس بارے میں کسی قسم کی سیاسی نیک نیتی کا ثبوت نہیں دیا اور جب تک تعلیم کے معاملات مکمل طور پر صاف ستھرے نہیں ہو جاتے ہم اپنے طلبہ کو حق اور صداقت کی تلاش کا راستہ نہیں دکھا سکتے۔

آج ہم بنیاد پرستی اور فرقہ واریت کا رجحان نچلے متوسط طبقوں اور

اونچے طبقوں دونوں میں پاتے ہیں اگرچہ دونوں میں ان کے اسباب
جدا جدا ہیں۔ نچلے متوسط طبقوں اور پچھڑی ہوئی ذاتوں میں یہ رجحان
اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب وہ میونسپل اور گورنمنٹ اسکولوں میں
جاتے ہیں جہاں وہ نصابی کتابوں اور ماحول میں پنپنے والے ذہنیت
کش ماحول کے سبب تنگ نظری اور مذہبی علاحدگی پسندی کا موقف
اختیار کرلیتے ہیں۔ جہاں تک اونچے طبقوں کا تعلق ہے وہ زیادہ تر
اپنے کیریر پر توجہ صرف کرتے ہیں جس کے لیے وہ ڈگریاں حاصل
کرتے ہیں اور اپنے لیے ایک پیشہ ورانہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں۔
فلسفیانہ سچ کی روحانی تلاش کا نہ ان کے پاس وقت ہوتا ہے اور نہ ہی
ان کا اس طرح کا کوئی رجحان ہوتا ہے۔

ہم آج اپنی تمام تر جدت پسندی کے باوجود عورتوں کو مساوی حق دینے
کے لیے تیار نہیں۔ ہماری نصابی کتابوں میں آج بھی عورتوں کو محض
آئیڈیل بیویوں اور اچھی ماؤں کے درجات سے نوازا جاتا ہے۔
ہمارے ہندو اور مسلم قوانین مذہب اور روایت کے نام پر عورتوں کو
انصاف دلانے سے قاصر ہیں۔ ہمیں انصاف کے مقابلے روایت زیادہ
عزیز ہے۔ ہم اپنی روایات کو لازمی طور پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں، خواہ
ان کا نتیجہ بدترین قسم کا استحصال ہی کیوں نہ ہو۔

اور ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اس طرح کی ناانصافیوں کو اپنی شناخت کے
نام پر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیاست داں سیاسی اقتدار کے
ہاتھ سے نکل جانے کے خوف سے ان قوانین کو بدلنے کے لیے تیار

نہیں۔ سیاست داں تعلیمی نظام کی اصلاح کے حق میں اس لیے نہیں کہ
عقلی اور انسانی زاویۂ نگاہ لوگوں کو ان کے حقوق سے اور زیادہ آگاہ
کردے گا اور ان کے اندر ایک بہتر اور منصفانہ سماج کو یقینی بنانے کے
لیے جو ایک ہمہ گیر معاشرت کا حامل ہو اور جہاں اقلیتوں کے حقوق کا
احترام ہو اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کو
پوری طرح درست کریں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو پھر ہمارا مقدر وہ جارحانہ
تصادمات اور خون خرابہ ہوگا جو نہ صرف ہمارے مستقبل کو تاراج
کردے گا بلکہ ہمیں ہمارے ماضی کی دلدل میں پھنسا کر رکھ دے گا۔"

'تعلیم' لغت کا ایک لفظ بھی ہے اور ایک اصطلاح بھی۔ علوم کے زمرے میں تعلیم
کی حیثیت ایک ارفع اہم علم یا ڈسپلن کی ہے جس کی ضرورت عالمی سماج کے ہر فرد کو
ہے۔ تعلیم سماج میں فرد کے مرتبے ہی کا نہیں، اس کے حقوق اور فرائض کی بھی یکساں
نشان دہی کرتی ہے۔ تعلیم ظالم کے ضمیر کو کچوکتی ہے اور مظلوم کو اس کے مظلوم ہونے کا
احساس دلاتی اور ظلم سے نکلنے کا راستہ بتاتی ہے۔ لیکن تعلیم کی یہی صفت ان لوگوں کو
پریشان کرتی ہے جنھوں نے ظلم اور ناانصافیوں کی بنیاد پر اپنی اجارہ داریاں قائم کر رکھی
ہیں، اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ عام آدمی تعلیم کے صحیح معنی اور مطالب سے آگاہ ہو۔ اس
حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بالغوں سے متعلق خواندگی
کے پروگراموں (Adult Literacy Programmes) کو تعلیم بالغاں (Adult
Education) کا نام دے دیا گیا ہے جب کہ تعلیم بالغاں کے ایسے مراکز کی کارکردگی
بالغوں کو صرف حروف آشنا کرانے تک محدود رہتی ہے، انھیں سماج کی ایسی کوئی ایجوکیشن یا
تعلیم نہیں دی جاتی جس سے وہ اپنی حالت زار سے آگاہ ہوسکیں اور اسے بدل ڈالنے کی

امنگ اور حوصلہ ان کے اندر پیدا ہوں۔ لاطینی امریکہ کے ماہر تعلیم پال فریرے نے اپنی مشہور کتاب Pedagogy of the Oppressed میں 'تعلیم' کی اس غلط تعبیر کو چیلنج کیا ہے۔ یہ کتاب سیدین کی وفات کے اگلے سال ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہی نہیں، پال فریرے نے تعلیمی اداروں میں رائج تعلیم کے اس فرسودہ طریقۂ کار پر بھی سوالیہ نشان لگایا ہے جہاں کلاس روم میں تعلیمی موضوعات کو بحث کا موضوع بنانے کے بجائے انھیں وعظ وفرمان کی حیثیت سے طلبہ کے سامنے بیان کردیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی انھیں بس اسی طرح ورد زبان کرلیں جیسے یہ ان کے اساتذہ کے ورد زبان ہیں۔ اسی لیے پال فریرے نے تعلیم کے تفاعلی طریقۂ کار (interactive method) کی بات کہی ہے جس کا ذکر ڈاکٹر اصغر علی انجینیر کے مضمون کے ضمن میں پہلے آچکا ہے۔ استحصال زدہ لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے پال فریرے لکھتے ہیں:

> ''دنیا کو اور خود اپنے آپ کو بھی، استحصال زدہ اپنی فریب خوردہ نظر سے دیکھتے ہوئے ایسی اشیا کے مانند سمجھتے ہیں جو استحصال پسندوں کی ملکیت ہیں۔ استحصال پسندوں کے لیے زندگی کے معنی ہیں، ان کے پاس تقریباً ہر زمانے میں سب کچھ ہونا اور ان لوگوں کی قیمت پر ہونا جن کے پاس کچھ نہیں، استحصال زدہ کے لیے ان کے وجودی تجربے کے کسی بھی لمحے میں زندگی کے یہ معنی ہیں کہ استحصال پسند کے مماثل نہ ہونا بلکہ اس کے زیرِ نگیں ہونا، اس پر منحصر ہونا۔ اس اعتبار سے استحصالِ زدہ اپنے محسوسات کی رو سے محتاج ہیں۔''

(Pedagogy of the Oppressed, Paulo Freiro, Penguin 1972, p.40)

خواجہ غلام السیدین بیسویں صدی کے وہ مفکر تھے جو بیسویں صدی کے اختتام سے ایک تہائی صدی پہلے ہی اپنا سفرِ حیات ختم کرچکے تھے۔ وہ ان ماہرینِ تعلیم میں سے تھے جو اپنے عہد کے فلسفۂ تعلیم کے معماروں میں تھے۔ آج ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف تعلیم کے معنی ہی سمجھنے کا مسئلہ نہیں، اس کی بقا کا سوال بھی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی ایک طرف مقابلہ جاتی معاشرے میں ان لوگوں کی بقا کا سامان لیے کھڑی ہے جو ایک خوش حال زندگی کا خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ قدروں کا معاملہ بھی اتنے پیچھے جا پڑا ہے جیسے آج کے انسان کو ان کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ایسے لوگ تو معاشرے میں ضرور پیدا ہوتے رہیں گے جنھیں اس صورتِ حال کا ادراک ہوگا اور جو اس کی تعبیر بیان کرنے کے اہل بھی ہوں گے۔ لیکن آج تعلیم کو ضرورت ہے نئے تقاضوں کو پورا کرنے والے ماہرینِ تعلیم اور معلموں کی جو خواجہ غلام السیدین جیسی بصیرت، ان جیسا دل اور ان جیسا کوشش رکھتے ہوں تاکہ تعلیم کی قلم رو سے نکلنے والی وہ نئی نسلیں پیدا ہوسکیں جن کی بدولت علم (knowledge) اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے درمیان ایک ایسا توازن برقرار رکھنے میں مدد مل سکے جو سب کی بقا، سب کی آسودگی اور سب کے ساتھ انصاف کا ضامن ہو۔ ہمیں انفارمیشن ٹکنالوجی تعلیم کی قیمت پر قبول نہیں، ہاں ہم اس کے ساتھ پرامن بقائے باہم اور انسانی اقدار کی سلامتی کی شرطوں پر مصالحت کرسکتے ہیں اور آج کے تناظر میں یہی صحیح موقف ہوگا۔

❁❁❁

اوکتاویو پاز

دوسری عالم گیر جنگ کی ہولناکیوں نے جہاں ایک طرف دنیا کے ان چھوٹے، پس ماندہ اور غلام ملکوں کو بھی دہشت میں مبتلا کر دیا تھا، جن کا براہ راست اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہیں بالواسطہ طور پر اس سے سیاسی بیداری کی وہ چنگاریاں بھی پھوٹ رہی تھیں جو پچھڑے ہوئے ملکوں کے لیے خوش آیند تبدیلیوں کی بشارت تھیں۔ چناں چہ ۱۹۴۵ء میں جب امریکی ایٹم بم نے آن کی آن میں اس جنگ عظیم کا فیصلہ کر کے رکھ دیا تو گویا تاریخ نے یہ فرمان جاری کر دیا کہ دنیا کے وہ تمام ملک جو سامراج، فاشزم اور ڈکٹیٹرشپ سے ایٹم بم کے بنا ٹکر لینا چاہتے ہیں ان کے پاس گوریلا وارفیر کے علاوہ دوسرا کوئی اور راستہ نہیں۔ اس اعتبار سے بیسویں صدی کے ربع دوم کا زمانہ لاطینی امریکہ میں گوریلا تحریکوں کے فروغ کا زمانہ ہے۔ یہ تحریکیں براہ راست اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان دنوں لاطینی امریکہ میں سیاسی بیداری کا جوار بھاٹا زوروں پر تھا۔ غلامی کے جوے کو اتار پھینکنے کا جذبہ اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کی خواہش لاطینی امریکہ کے تمام باشندوں کی، خواہ ان کا تعلق کسی گوریلا تحریک سے ہو یا نہ ہو، عام پہچان بن گئی تھی۔

سیاسی بیداری کی اس فضا نے لاطینی امریکہ کے ادب کو بھی خاطر خواہ متاثر کیا۔ چناں چہ لاطینی امریکہ کے ادب کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ ۱۹۴۰ء تک آزاد اور بالغ ہو چکا تھا۔ اس سے قبل لاطینی امریکہ کے وہ ادیب اور شاعر بھی جو طبع زاد صلاحیتوں کے مالک تھے، ادب میں اپنا مرتبہ تسلیم کیے جانے کے لیے پیرس اور میڈرڈ ہی سے سند حاصل کرتے تھے۔ میکسیکی انقلاب کی کامیابی نے لاطینی امریکہ کے دانش وروں کا حوصلہ بڑھایا، جس نے انھیں ایک ایسے لبرلزم کی راہ دکھائی جس کی جڑیں خود ان کی اپنی زمین میں پیوست تھیں اور جسے نہ تو مارکسزم کے سہارے کی ضرورت تھی اور نہ یانکی (yankee) سیادت کی۔ لاطینی امریکہ کو اس دور میں فکری اعتبار سے خود کفیل بنانے میں بہت بڑا رول ہٹلر کے خلاف ان کی اس جنگ کا بھی ہے جو چھ سال جاری رہی۔ آگے چل کر اس رجحان کو مزید تقویت پہنچائی اس صدی کے ساتویں دہے کے اوائل میں رونما ہونے والے کیوبا کے واقعات نے۔ یہ وہ تاریخی مد و جزر تھا جس کے ہچکولے کھاتے ہوئے اوکتاویو پاز کے بیدار تخلیقی اور انقلابی ذہن کا نشو و نما ہوتا رہا یہاں تک کہ پاز کا شمار اس زمانے کے ان بڑے شاعروں اور مفکروں میں ہونے لگا جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ پابلو نرودا کے بعد اوکتاویو پاز اس گزرتی ہوئی صدی کا دوسرا عظیم لاطینی امریکی شاعر تھا۔

میکسیکو کا شاعر اوکتاویو پاز (۱۹۱۴ء تا ۱۹۹۸ء) ۱۹/اپریل ۱۹۹۸ء کو میکسیکی عوام کو غم گسار چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس صدی کے انتہائی بااثر پبلک دانش وروں میں سے ایک تھا۔ ۱۹۵۰ء میں پاز کو ادب کا نوبل انعام ملا تھا۔ ٹالسٹائی اور ٹیگور کی طرح پاز کی دل چسپیوں کا دائرہ بھی کافی وسیع تھا۔ پاز کا شاعرانہ لب و لہجہ بے پناہ غنائیت میں ڈھلا ہوا تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا

ے کہ ٹی ایس ایلیٹ کی طرح اس کی شعری تشکیل میں بھی مختلف سروں کے امتزاج کی
یفیت تھی۔

اوکتاویو پاز کا بچپن میکسیکو کے Miscoac نام کے ایک گاؤں میں گزرا تھا،
ں اس کا ایک بڑا سا خاندان، گھر اور ایک باغ بھی تھا۔ میکسیکو میں سول نافرمانی کی
یک اور انقلاب کے اثرات نے اس گاؤں کو مفلوک الحال بنا کر رکھ دیا تھا۔ گاؤں کا
ھر جو قدیم طرز کے فرنیچر، کتابوں اور دوسری چیزوں سے آراستہ تھا، آہستہ آہستہ ریزہ
یزہ ہوتا چلا گیا۔ پاز نے اپنی ابتدائی نظمیں اجداد کی اسی نایاب اور مسمار ہوتی ہوئی
راث پر تخلیق کی ہیں۔ پاز کے دادا ایک صحافی اور ادیب تھے جو فرانسیسیوں کے ساتھ
ہ آزما رہے تھے اور پاز کے باپ ایک وکیل تھے جنھوں نے میکسیکو کے انقلاب میں
صہ لیا تھا۔ پاز کی ماں اندلس کی ایک ہسپانوی مہاجر تھیں۔ اوکتاویو پاز نے اس عہد کی
نی ساری نظمیں ایک ایسے رسالے میں شائع کرائیں جس کی بنا میکسیکو کے چھ نوجوان
اعروں نے اس اشتیاق کے ساتھ ڈالی تھی کہ وہ اپنی تخلیقات کو چھپا ہوا دیکھنا چاہتے
تھے۔ انیس سال کی عمر میں پاز کی پہلی کتاب 'وحشی چاند' (Luna Silvestre) شائع
ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں اینٹی فاشسٹ رائٹرز کی دوسری بین الاقوامی کانگریس کے موقعے پر پاز
ی ملاقات Auden, Spender, Vallejo, Machardo,Abreti, Cernuda
ور Neruda جیسے اس عہد کے نام ور قلم کاروں سے ہوئی۔ پابلو نرودا نے اپنی
یادداشتوں میں لکھا ہے کہ "پاز اس بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کرنے کے لیے اپنے
ارا ایڈونچرز اور مس ایڈونچرز کے بعد میکسیکو سے یہاں پہنچا تھا اور مجھے فخر تھا کہ اسے اس
کانگریس میں لانے کا سہرا میرے سر تھا۔ اس وقت تک پاز کی صرف ایک ہی کتاب
شائع ہوئی تھی جو مجھے دو مہینے پہلے ملی تھی اور اس کتاب کے مطالعے سے مجھے اندازہ ہوا

کہ وہ صحیح معنوں میں ادب کے میدان میں کچھ کر دکھانے والا ہے۔ اس وقت تک پاز کو
کوئی نہیں جانتا تھا"۔ پاز کی اس کے بعد کی زندگی زبردست قسم کی ادبی سرگرمیوں میں
گزری۔ اس دوران اس نے بہت سے رسائل کا اجرا کیا اور بے شمار انتھالوجیاں تیار کیں
جن میں ہسپانوی زبان کی شاعری کا مجموعہ Laurel سب سے زیادہ مشہور ہے۔

میکسیکو کے خارجی امور کے محکمے کی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں اوکتاویو
پاز نے دنیا کے مختلف خطوں کا دورہ کیا جن میں پیرس، نیویارک، سین فرانسسکو، جنیوا اور
نئی دہلی شامل ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں پاز میکسیکو کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ اس
سے پہلے وہ ۱۹۵۱ء میں بھی چھ ماہ کی قلیل مدت کے لیے یہاں جونیر سفیر کی حیثیت سے
رہ کر جا چکا تھا۔ ہندوستان کے دورانِ قیام ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک کا زمانہ پاز کے قلب
ماہیت کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اس کا ثبوت پاز کے شعری مجموعے East Slope
کی نظموں اور ان دوسری نگارشات سے ملتا ہے جو اس کی تصانیف کے مجموعوں
Alternating Current, Conjunctions and Disconjunctions,
The Monkey Grammarians اور In Light of India میں شامل ہیں۔ پاز
نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ہندوستان میں خیرگی، ہیبت، مدہوشی، حیرت،
سرخوشی، ولولہ، Nausea اور ایک ناگزیر قسم کی کشش جیسی گوناگوں کیفیات سے دوچار ہوا
ہے۔ پاز کا کہنا تھا کہ ہندوستان میرے وجود میں دماغ کے راستے نہیں بلکہ میری
آنکھوں، کانوں اور دوسرے حواس کے وسیلے سے داخل ہوا ہے۔ ہندوستان میں اوکتاویو
پاز کو حقیقت اس درجہ فراوانی کے ساتھ نظر آئی کہ اس نے ہر چیز کو اس کے سامنے غیر حقیقی
بنا کر رکھ دیا۔ اوکتاویو پاز نے ہندوستان میں اپنے آپ کو اس نقطۂ عروج پر کھڑا پایا
جہاں سے وہ آگے کی ان انتہاؤں میں جھانک کر دیکھ سکتا تھا جنھیں کوئی نام نہیں دیا

جاسکتا۔ ہندوستان ہی کی دھرتی پر پاز کی ملاقات Marei-Jose Tramini سے ہوئی اور پھر ہندوستان ہی میں دونوں کی شادی ہوئی۔ نئی دہلی میں میکسیکی سفارت خانے کا ہرا بھرا لان اب پاز کی اس شادی کی تقریب کی ایک یادگار بن کر رہ گیا ہے جہاں پچھلے دنوں پاز کے ہندوستانی شیدائیوں نے اس کی موت کے بعد پھر ایک شام پاز کی یاد میں منائی اور اس کی نظمیں پڑھ پڑھ کر اسے یاد کیا۔ Tramini کے ساتھ اپنی ملاقات اور پھر شادی کو پاز نے اپنی زندگی کا سب سے اہم واقعہ قرار دیا ہے۔ اوکتاویو پاز کی اس دور کی نظموں کو ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کی دریافت کی ہیجان انگیز مہم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بعض نظموں کے عنوانات ہی ہندوستان کے ساتھ اس کی دل بستگی کا روشن ثبوت ہیں جیسے: 'اتوار کو ایلیفنٹا پر'، 'ہماچل پردیش'، 'ورندابن'، 'اوٹی'، 'لودھی گارڈن'، 'ہمایوں کا مقبرہ'، 'کوچین'، 'مدورائی' اور 'ادے پور کا ایک دن' وغیرہ۔ اوکتاویو پاز نے ہندوستان کا دورہ ایک سیاح کی طرح نہیں بلکہ ایک زائر (pilgrim) اور ایک مہم جو کی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی روح کے اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ اس کے بعد ہندوستان کی وہ بھڑکیلی مشرقیت اسے اپنے دام فریب میں نہیں لاسکی جو باہر سے مستعار لی ہوئی تھی۔ پاز کا نظریۂ وقت بھی ہندوستانی فلسفے سے متاثر ہے جس کا اظہار دہلی پر اس کی نظم 'بالکونی' میں ہوا ہے جہاں اس نے وقت کی جامد رفتار کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۶۸ء میں جب میکسیکو میں طالب علموں کا قتل عام ہوا تو پاز نے احتجاج کے طور پر سفارت سے استعفیٰ دے دیا اور کچھ دن کے لیے از خود جلاوطن ہوکر پیرس میں جابسا۔ لیکن پاز کی روح تو جیسے ہندوستان ہی میں بھٹک رہی تھی، وہ جلد ہی ہندوستان واپس آگیا۔ پاز کا قول تھا کہ ہندوستان ایک ایسا کھولتا ہوا کڑھاؤ ہے کہ جو ایک بار اس میں گر گیا پھر نکل نہیں سکتا۔

اوکتاویو پاز کی موت آج کے عہد کی ادبی دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ اس موت سے کچھ دیر کے لیے وہ معصوم آرزوئیں بھی سہم کر رہ گئی ہیں جو کرۂ ارض پر ایک بہتر انسانی زندگی کے خواب بنتی رہتی ہیں۔

اوکتاویو پاز کو پچھلے دنوں دنیا بھر کے رسائل اور اخبارات نے بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعض اُردو رسائل نے بھی پاز کی موت کے سانحے کو اسی قدر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اس موقعے پر پاز کی جن نظموں کے اُردو تراجم رسائل میں شائع ہوئے ہیں ان میں پاز کی مختصر نظم 'شاعر کا کتبہ' (ترجمہ: احمد سہیل) کئی جگہ نقل ہوئی ہے۔ ہم بھی پاز پر اپنی اس گفتگو کا اختتام اسی نظم کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں:

شاعر کا کتبہ
وہ گانے سے تھک چکا ہے
تمھیں یاد نہ ہو
اس کی زندگی کے سچ کا جھوٹ
اور تمھیں یاد ہو
اس کی زندگی کے جھوٹ کا سچ

✿✿✿

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ان خوش نصیبوں میں تھے جنھیں اپنے دور کے بہترین لوگوں کی صحبتیں نصیب ہوئیں، جنھیں حالات نے تحصیلِ علم کے بھی وافر مواقع فراہم کیے اور جن میں حسبِ توفیق ذہانت بھی تھی۔ وہ جبلّی ہنرمند بھی تھے لہٰذا عملی زندگی میں بھی وہ جن جن عہدوں پر فائز رہے، انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو وہاں بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ وہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی، پنجاب کی اس اُردو تہذیب کے فرزند تھے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مشترکہ تخلیقی قدر اور تہذیبی میراث تھی۔ اس مشترکہ قدر اور تہذیب نے ایک ایسے مسلک (اور مسلک ایک ایسی اصطلاح ہے جس سے بنا کچھ کہے ایک متصوفانہ رواداری کی مہک تو آتی ہی ہے) کی شکل اختیار کر لی تھی جہاں یہ سب لوگ ایک ہی فرقے کے افراد جیسے تھے۔ اس اعتبار سے اس مسلک یا فرقے کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں جدا جدا فرقہ واریت کی کوئی بو نہیں تھی۔ تقسیم کے بعد پاکستانی پنجاب کے جن مسلمانوں نے اس مسلک کے ہندوؤں اور سکھوں کو مار مار کر سرحد کے اس پار پہنچایا وہ مسلمان یقیناً اس مسلک کے حلقے سے باہر کے لوگوں میں سے

تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان سے لُٹ پٹ کر آنے والے ان ہندو اور سکھ ادیبوں اور شاعروں نے ان سانحات پر دردِ انسانیت کے ناتے خون کے آنسو تو ضرور بہائے لیکن ان کے دلوں میں سرحد کے اس طرف کے اُردو عزیزوں کی طرف سے اتنی سی بھی کھٹاس نہیں آئی اور نہ ہی پاکستان کے ان کے اُردو عزیز آج تک کبھی ان کو بھلا پائے۔ دونوں ملکوں کی ستاون سالہ سیاست اپنی جگہ لیکن دونوں ملکوں کی یہ اُردو برادری موقع بہ موقع کبھی یہاں اور کبھی وہاں ایک دوسرے کے ساتھ اسی گرم جوشی سے ملتی رہی ہے اور آج بھی ملتی ہے۔ پنجابیوں میں اُردو کے ساتھ اس درجہ عشق کی انتہا اگر دیکھنی ہو تو سرحد کے اس پار 'مخزن' کے بانی سر عبدالقادر اور ادبی دنیا کے مولانا صلاح الدین احمد (مرحومین) کو اور سرحد کے اس پار مالک رام اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد (مرحومین) کو دیکھیے جن کا اصرار تھا کہ پنجابی سر آنکھوں پر مگر پنجاب کی علمی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی زبان تو اُردو ہی ہے۔

تقسیم سے پہلے کے اس پنجاب کی اُردو دنیا کیسی تھی جو بعد میں پاکستان میں چلا گیا، یہ دیکھنا ہو تو پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا کتابچہ 'میرے گزشتہ روز و شب' اور گوپال متل کی 'لاہور کا جو ذکر کیا' اٹھا کر دیکھیے۔ یہ دونوں رپورتاژ ان دونوں حضرات نے تقسیم کے لگ بھگ بیس برس بعد ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے ہیں لیکن انھیں پڑھیے تو لگتا ہے جیسے وہ ابھی تک لاہور ہی میں رہ رہے ہیں۔ آزاد صاحب زندگی کی آخری سانس تک اپنے اس مسلک پر ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ پابند رہے۔ ان کی کتابیں یہاں بھی چھپتی تھیں اور پاکستان میں بھی۔ ان کی جتنی پذیرائی ہندوستان میں ہوتی تھی اتنی ہی بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ پاکستان میں ہوتی تھی۔ گوپال متل نے یہاں پہنچنے کے بعد اگرچہ بعض کاروباری مصلحتوں کی بنا پر اپنا سیاسی موقف ضرور بدل لیا لیکن وہ اپنے صلحِ کُل والے اُردو

مسلک پر اسی سلامت روی کے ساتھ قائم رہے جو شروع سے ان کا نشانِ امتیاز تھا۔

(۲)

بحیثیت انسان آزاد صاحب انتہائی ملنسار، خوش اخلاق، دوست دار اور مہمان نواز تھے۔ وہ اپنے خردوں کی بھی اس درجہ پذیرائی کرتے تھے کہ اپنے برابر میں انھیں جگہ دیتے تھے۔ وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک تھے۔ ان کے مزاج میں نرمی بھی بلا کی تھی۔ انھیں شاید ہی کبھی کسی نے غصہ ہوتے دیکھا ہو۔ اقبال کے وہ کتنے پرستار تھے یہ بات کون نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ۱۹۷۷ء میں ایک اقبال صدی سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا تھا، یہ سمپوزیم جواہر لال نہرو کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کی جانب سے پروفیسر محمد حسن کے زیرِ نگرانی منعقد ہوا۔ اس سمپوزیم کے ایک اجلاس میں کسی طالب علم کو اقبال کا کلام ترنم کے ساتھ پیش کرنا تھا۔ وہ طالب علم کسی وجہ سے اس اجلاس کے وقت وہاں نہ پہنچ سکا، اتفاق سے اس موقعے پر آزاد صاحب بھی وہاں موجود تھے، وہ ان دنوں سری نگر میں پریس انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر فائض تھے۔ منتظمین سمپوزیم کو اس موقعے پر پریشان دیکھ کر آزاد صاحب نے پیش کش کی کہ میں کھڑا ہو کر اقبال کا کلام پڑھے دیتا ہوں۔ محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ نہیں آزاد صاحب، آپ کا یہ منصب نہیں کہ جو کام میں کسی طالب علم سے لینا چاہتا تھا اسے آپ انجام دیں۔ آزاد صاحب نے فرمایا، اس سمپوزیم میں اقبال کا کلام پڑھنا تو میرے لیے باعثِ سعادت ہوگا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مائک پر اقبال کا کلام ترنم کے ساتھ پڑھ دوں۔ پھر اس کام کے لیے کلیاتِ اقبال کی تلاش شروع ہوئی تو آزاد صاحب نے فرمایا کہ اقبال کے معتقد اور مداح کو کلیات کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ سنائیں گے کیا، حسن صاحب نے آزاد صاحب سے پوچھا۔ 'جو آپ حکم دیں'۔ آزاد صاحب نے جواب دیا، 'پھر

چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن'۔ پروفیسر محمد حسن نے اقبال کا مصرع پڑھتے ہوئے کہا، 'ہم نے تو یہی سوچا تھا، ویسے جو آپ کے حافظے میں ہو وہ سنا دیجیے'۔ 'تو پھر یہی پیش کیے دیتا ہوں' آزاد صاحب نے یہ کہا اور مائک پر پہنچ گئے اور اپنی مخصوص اور قدرے غنائی ہوئی آواز میں اقبال کی یہ پوری غزل بڑے دل گداز انداز میں پیش کی اور ایک سماں باندھ دیا اور اپنی یادداشت سے تمام ہی شعر روانی کے ساتھ سنا ڈالے۔

(۳)

آزاد صاحب کے ساتھ میری اور خلیق انجم کی ملاقات ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے توسط سے ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ آزاد صاحب اس زمانے میں موتی باغ میں رہتے تھے۔ زورؔ صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ دہلی آنے سے پہلے خلیق انجم کو ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیا کرتے تھے کہ میں فلاں دن پہنچ رہا ہوں۔ وہ G.T. ایکسپریس سے آتے تھے اور ان کی گاڑی صبح نئی دہلی اسٹیشن پہنچتی تھی۔ اکثر خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب بھی زورؔ صاحب سے ملنے اسٹیشن پہنچتے تھے چناں چہ خواجہ صاحب کے ساتھ بھی ہمارا پہلا باقاعدہ تعارف زورؔ صاحب ہی کے توسط سے ہوا۔ زورؔ صاحب کا یہ دستور تھا کہ دلّی میں جہاں بھی ٹھہرتے تھے مجھے اور خلیق انجم کو یا تو ساتھ ہی لے جاتے تھے یا وہاں پہنچنے کے لیے کہہ دیا کرتے تھے، سوائے خواجہ احمد فاروقی صاحب کے، کہ خواجہ صاحب ملنے جلنے کے معاملے میں حفظِ مراتب کو بہت زیادہ ملحوظ رکھتے تھے۔ خیر تو ہماری سعادت یہ تھی کہ جب ہم زورؔ صاحب کے ساتھ آزاد صاحب کے دولت خانے پر پہنچے تو ہمیں پروفیسر تلوک چند محرومؔ کا نیاز حاصل کرنے کا بھی موقع ملا۔ یہ گویا ہمارے لیے زورؔ صاحب اور آزاد صاحب دونوں کے فیض سے تھا۔ محرومؔ صاحب کی نظمیں ہم بچپن سے نصاب کی کتابوں میں پڑھتے چلے آئے تھے اور نصاب میں شامل ایسے ادیبوں اور شاعروں کے

بارے میں، جنھیں ہمیں کبھی بھی کہیں دیکھنے کا موقع نہ ملتا تھا، ہمارا تصور یہ تھا کہ یہ شاید کسی دوسری ہی دنیا کے لوگ ہیں۔ ایسے میں محروم صاحب سے مل کر ہم خوشی اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا ہوگئے۔ ہم پرانی دلّی سے زور صاحب اور آزاد صاحب کے لیے کالی مسجد کی نہاری لے گئے تھے جو اُس زمانے میں کافی مشہور تھی اس لیے کہ شیدو نہاری والے اس وقت تک زندہ تھے اور اس علاقے میں نہاری کی ایک ہی دوکان بس انھی کی تھی اور اب تو یہ عالم ہے کہ آپ دلّی میں چپے چپے پر اور صبح شام ہر وقت نہاری لے لیجیے۔ آزاد صاحب اور زور صاحب نے اور ان کے ساتھ ہم نے نہاری خوب لطف لے کر کھائی، البتہ محروم صاحب نے ناشتے پر صرف انڈے اور ڈبل روٹی ہی پر اکتفا کیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ آزاد صاحب بلا کے خردنواز تھے، نجی صحبت میں اور ان اجتماعی صحبتوں میں جن میں ہمیں وہ شریک کرنا کبھی نہ بھولتے تھے، ہمارے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ کے ساتھ ساتھ دوستانہ بھی ہوتا تھا۔ وہ ہمیں ہنرمند اور باصلاحیت سمجھتے تھے اور اس لیے اور زیادہ ہماری قدر کرتے تھے کہ ہم ابھی نوجوانی کی بھی ابتدائی منزلوں ہی میں تھے اور وہ ہم سے یہ امید اور توقع رکھتے تھے کہ آنے والے دنوں میں ہم بھی ضرور کچھ کر دکھائیں گے۔ آزاد صاحب کی جب بھی کوئی نئی کتاب چھپتی، وہ ہمیں یہ کتاب بڑی محبت کے ساتھ اپنے آٹوگراف کے ساتھ پیش کرتے۔

(۴)

۱۹۶۱ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا گیا۔ اس سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے کا انتظام آزاد صاحب کے سپرد تھا۔ چناں چہ اس مشاعرے میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ موضوعاتی مشاعرہ تھا جس میں شعرا کو موتی لال نہرو ہی پر

نظمیں لکھنی تھیں۔ آزاد صاحب نہ صرف یہ کہ بلا کے بذلہ سنج تھے بلکہ وہ ایسے مذاق کی بھی بھرپور داد دیا کرتے تھے جس کا ہدف خواہ وہ خود ہی ہوں۔ موتی لال یادگاری مشاعرہ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان واقع پریڈ گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ پریڈ گراؤنڈ کی اس زمانے میں وہ حالت نہیں تھی جو اب ہوگئی ہے، وہ ہری بھری گھاس کا ایک لمبا چوڑا میدان تھا جو جامع مسجد پر ہرے بھرے صاحب اور شاہ سرمد کے مزار سے شروع ہوکر پتھر والے تک چلا گیا تھا۔ اس میدان میں مداری، تیل مالشیے، پھٹیچر شاعروں کی منڈلیاں، شطرنج، تاش، چوسر اور پچیسی کھیلنے والوں کی چوکڑیاں، بازاری دوا فروش، بھکاری، گھاس پر اینڈتے اور لوٹتے ہوئے بیکار لوگ غرض چپے چپے پر طرح طرح کا منظر ہوا کرتا تھا۔ شہر میں آنے والے سرکس بھی اسی میدان میں لگتے تھے۔ اسی پریڈ گراؤنڈ میں ایک جانب شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی درگاہ بھی ہے۔ جشن موتی لال نہرو صدی کے مشاعرے کا اسٹیج درگاہ کے قریب ہی لگا تھا۔ یہ اپریل ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے مشاعرے کے لیے شامیانہ نہیں تانا گیا تھا، صرف اسٹیج لگایا گیا تھا۔ درگاہ شاہ کلیم اللہ میں عشا کی نماز ختم ہونے کے بعد تقریباً رات کے ساڑھے نو بجے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور مشاعرہ ابھی تک جاری تھا۔ آزاد صاحب منتظم کی حیثیت سے اسٹیج پر بیٹھنے کے بجائے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر جائزہ لیتے جا رہے تھے، اس دوران میں بھی اپنا کلام پڑھ کر اسٹیج سے نیچے اُتر آیا اور آزاد صاحب کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ آزاد صاحب نے انتہائی مسرت کے عالم میں مجھ سے کہا، دیکھیے رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور مجمع ابھی تک جما بیٹھا ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ آزاد صاحب یہ لوگ جو ابھی تک یہاں بیٹھے رہ گئے ہیں آپ کے مشاعرے کے سامعین نہیں، یہ تو وہ لوگ ہیں جو رات کو اس میدان میں آکر سوتے

ہیں، یہ مشاعرہ ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آزاد صاحب بے ساختہ ہنس دیے اور پھر انھوں نے یہ لطیفہ بعد میں کئی لوگوں کو مختلف موقعوں پر سنایا۔ ایک بات اور — کچھ دن بعد 'عقیدت کے پھول' کے عنوان سے جشنِ موتی لال کے مشاعرے کی روداد کتابی شکل میں شائع ہوگئی۔ اس کتاب میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میری نظم اس میں دوسرے ہی نمبر پر تھی، پہلی نظم آل احمد سرور صاحب کی تھی۔ دراصل آزاد صاحب نے کتاب میں شعرا کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی تھی۔ پہلے نمبر پر انھوں نے آل احمد سرور صاحب کو اور دوسرے پر مجھے رکھا تھا۔ اگر آل احمد سرور صاحب کے نام کی ابتدا الف مد (آ) کی بجائے کہیں محض الف سے ہورہی ہوتی تو عجب نہیں تھا کہ وہ اس ترتیب میں پہلے مجھے ہی رکھ دیتے۔ آزاد صاحب مذاق کے معاملے میں کتنے کشادہ دل تھے، اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ کلاں محل میں خلیق انجم کے گھر بیٹھے ہم لوگ کباب اور روٹی کھا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں آزاد صاحب نے کہا، 'بیکراں' کے چار ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، آزاد صاحب! یہ اڈیشن آپ چھپوا چھپوا کر رکھتے کہاں ہیں۔ آزاد صاحب نے اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ اگرچہ اس لطیفے کو آج چالیس سال سے زیادہ ہوچکے ہیں لیکن آزاد صاحب کو اب بھی یہ لطیفہ کبھی کبھی یاد آجاتا تھا اور وہ نئے لوگوں کو بڑے لطف لے کر یہ سنایا کرتے تھے۔

آزاد صاحب جب سے انجمن کے صدر ہوئے تھے، ان کے ساتھ قربتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ انتہائی منکسر المزاج قسم کے انسان تھے۔ جب کسی سے ملتے تو بڑھ کر سلام کرتے اور اگر کرسی پر بیٹھے ہوں تو اُٹھ کر ہاتھ ملاتے اور اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں تھی۔ ان کے پاس پرانی یادوں کا انتہائی بیش قیمت ذخیرہ تھا

اور اس عمر میں بھی ان کی یادداشت پر رشک آتا تھا۔ ان کی کتابیں بکتی بھی خوب تھیں، کچھ تو ان کی شخصیت کے اثر سے اور کچھ معاملاتِ کاروبار میں ان کی فہم وفراست کے سبب اور ان کے معاملاتِ کاروبار میں فہم وفراست کی حدود، بس شائع شد؛ کتاب کی تین چار سو جلدوں کی فوری اور سودمند فروخت تک ہی تھیں۔ یہ ہوجانے کے بعد تو پھر وہ اپنی کتابیں انتہائی فراخ دلی کے ساتھ احباب میں تقسیم کرتے تھے۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے انجمن کے معاملات میں نہ تو کبھی بے جا مداخلت کی اور نہ ذاتی طور پر کوئی جائز یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اختلاف رائے کا تو ان کے ہاں جیسے کوئی خانہ ہی نہیں تھا۔ جب کبھی انجمن کے دفتر میں ہوتے تو حسبِ دستور دوپہر کا کھانا انجمن کے کارکنان کے ساتھ مل بیٹھ کر کھاتے۔ کہتے تھے اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ ایک بار انجمن کے دفتر میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ خوش گپیوں کا سلسلہ جاری تھا، اچانک میں نے ایک فی البدیہہ شعر کہہ کر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر آزاد صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ آزاد صاحب نے مسکراتے ہوئے اس شعر کا مطالعہ کیا اور اپنی جیب سے ڈائری نکالی، اس شعر کو اس میں نقل کیا اور پھر شعر کا پرزہ خلیق انجم کی طرف بڑھا دیا۔ خلیق انجم نے بھی یہ شعر بہ آوازِ بلند پڑھتے ہوئے پاس بیٹھے تمام احباب کو سنایا اور انجمن کے آرکائیوز میں اسے داخل کردیا۔ شعر یہ تھا:

حضرت آزاد و انجم دونوں نذرِ انجمن
ایک صدرِ انجمن اور ایک غدرِ انجمن

سمجھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں غدرِ انجمن کی ترکیب کا استعمال قدرے مسخرے پن کے ساتھ خلیق انجم کی بے انتہا متحرک اور فعال شخصیت کے تعلق سے کیا گیا ہے۔

❁❁❁

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

اُردو زبان اور ادب کے واسطے سے سرزمینِ دکن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اُردو کے ایک شیدائی نے ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اُردو کی خدمت کی اور دوسرے نے اسی سرزمین سے اٹھ کر اُردو کے لیے اپنی ان گراں قدر خدمات کا آغاز کیا جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان میں سے پہلے مولوی عبدالحق تھے اور دوسرے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ۔ یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے کہ مولوی عبدالحق کے ساتھ اہلِ دکن کے کیا معاملات تھے، تاہم اتنا ضرور ہے کہ اورنگ آباد میں بیٹھ کر مولوی عبدالحق نے جو کام کیا اس سے وہاں اس قسم کی فضا ضرور بنی کہ اُردو کے دامن میں کلاسیکی ادب کا ایک شاندار سرمایہ ہے، جسے کھنگالنے اور جس پر از سرِ نو تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام نہ صرف یہ کہ انتہائی محنت اور عرق ریزی چاہتا تھا بلکہ اس کے لیے ایسے اسکالروں کی ضرورت تھی جو بھرپور تاریخی اور سماجی شعور بھی رکھتے ہوں۔ سرزمینِ دکن کو ڈاکٹر محی الدین زورؔ کی شکل میں اُردو کا ایسا ہی خدمت گار مل گیا۔

مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کے درمیان یقیناً کچھ اختلافات بھی تھے لیکن ان اختلافات کی بنیاد پر انھیں ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھا جاسکتا، اس لیے کہ دونوں کے کام کی نوعیت قدرے مختلف تھی، چنانچہ ان دونوں شخصیتوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ان کا آپس میں مقابلہ کرنے کے بجائے انھیں ایک دوسرے کے تناظر میں دیکھنا زیادہ صحیح ہوگا۔ شاید اسی عمل سے گزرتے ہوئے ہم ڈاکٹر زورؔ کی ادبی شخصیت کی شناخت کرسکیں گے۔

مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ دونوں میں اُردو زبان اور ادب کی خدمت کا انتہائی جذبہ تھا۔ دونوں اپنے اندر کام کرنے کا بے پناہ حوصلہ اور ہمت رکھتے تھے اور دونوں کے کام کرنے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ اس کے ساتھ ہی مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ علاحدہ علاحدہ طور پر کچھ ایسی انفرادی خصوصیات کے بھی حامل تھے جن کی بنیاد پر دونوں شخصیتوں کے درمیان بہ آسانی امتیاز پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کی شخصیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے بالواسطہ طور پر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں سے ایک پورب تھا اور دوسرا پچھم۔ یعنی اگر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کی شخصیتوں اور ان کے ادبی کارناموں پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو یہ نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہوگا کہ دونوں کے راستے ایک دوسرے سے مختلف تھے یعنی تصوف کی اصطلاح میں ایک کو صاحبِ حال اور دوسرے کو صاحبِ قال کہا جاسکتا ہے۔ اُردو سے متعلق مولوی عبدالحق کے معاملات عشق کا درجہ رکھتے تھے اور ڈاکٹر زورؔ انھیں عقل کی عینک سے دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ لیکن یہاں عشق اور عقل کی یہ تفریق وہ بھی نہیں جو اقبال نے اپنی شاعری میں پیدا کی تھی بلکہ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُردو کے معاملے میں مولوی عبدالحق کی ذات اپنے آپ میں اُردو کی ایک زبردست تحریک تھی اور ڈاکٹر زورؔ اُردو کا

ایک جامع اور فعال ادارہ تھے۔ کسی بھی زبان اور اس کے ادب کی بقا کا انحصار ایک تحریک پر بھی ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ اداروں پر بھی۔ اس اعتبار سے انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو کی ایک ملک گیر تحریک کا نام ہے اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو، اُردو کے ان قابلِ ذکر اداروں میں سے ایک ہے جو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تحریک اور ادارے میں ایک فرق شاید یہ بھی ہے کہ تحریک اجتماعی ہونے کے باوجود اکثر ایک فردِ واحد کی ذات سے عبارت ہوتی ہے اور جب کسی تحریک پر مولوی عبدالحق جیسی قدآور شخصیت چھا جاتی ہے تو اس کی حیثیت ایک ایسے چھتنار درخت کی سی ہوجاتی ہے جس کے آس پاس دوسرے پودوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ ایک تاریخی منطق ہے جس کو خود مولوی عبدالحق بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ اس لیے ان کے ایک سوانح نگار کا یہ شکوہ شاید بجا نہیں کہ ''افسوس کہ مولوی صاحب ایک ایسے سرسید تھے جو محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خاں، جسٹس کرامت حسین اور مولوی چراغ علی یار جنگ جیسا ایک بھی رفیق کار نہ بنا سکے۔''

کسی تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر پہنچنے کے بعد اپنا مقصد پورا کر کے یا اس میں ناکام ہو کر معدوم یا بے جان ہوجاتی ہے جبکہ اداروں کا یہ معاملہ ہے کہ تاریخی حالات کے تحت ان کے سامنے نئے نئے مقاصد آتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ عام طور پر زندہ اور فعال رہتے ہیں۔ تحریک کے برعکس کوئی ادارہ کسی فردِ واحد کے بل پر وجود میں تو آسکتا ہے لیکن آگے چل کر اس کی بقا اور موثر کارکردگی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ ڈاکٹر زورؔ نے اداروں کی اس منطق کو سمجھتے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لیا۔

۱۔ "تہ داریاں" خوب کہا۔ بات میں تہ۔

آج دکنی ادبیات کی حد تک زورؔ صاحب کے ساتھ جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مولوی عبدالقادر صدیقی، نصیر الدین ہاشمی اور پروفیسر عبدالقادر سروری جیسے لوگ شامل ہیں۔

محمد عتیق صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں زورؔ صاحب کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن اسی مضمون میں مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر زورؔ کو مولوی عبدالحق پر فوقیت دی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ بات اس اعتبار سے غیر منطقی ہے کہ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ کے درمیان موازنے یا مقابلے کی کوئی صورت ہی نہیں پیدا ہوتی اس لیے کہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر ایک phenomenon تھے۔ عتیق صاحب فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر زورؔ نے انتہائی دانش مندی سے کام لے کر اپنا دائرۂ عمل اُردو کی ترویج اور اشاعت اور اُردو کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی خزانوں کو مالا مال کرنے کی کوششوں تک محدود رکھا۔ ان میدانوں میں ان کو اپنی توقعات سے زیادہ کامیابی — خصوصاً ۱۹۴۷ء کے بعد نصیب ہوئی۔ یہ انتہائی افسوس ناک بات مولوی عبدالحق مرحوم کے باب میں نہیں کہی جاسکتی۔''

مولوی عبدالحق کے ناقدین کی خدمت میں یہ بات عرض کرنی ہے کہ زورؔ صاحب ایک شاندار ادارہ تھے اور ادارے ہمیشہ تحریکوں کی کوکھ سے ہی پھوٹتے ہیں۔ تحریکیں جنونی ہوتی ہیں اس لیے انھیں بار بار عقل یا منطق کی کسوٹی پر نہیں کسا جاسکتا۔ دریا کی طغیانی اپنے ساتھ چھوٹے موٹے دیہاتوں کو ضرور بہا لے جاتی ہے لیکن ساحلوں کی حدود سے چھلک کر سیلاب کا پانی جب میدانوں میں پہنچتا ہے تو وہ قحط سالی کا بھی خاتمہ کرتا ہوا چلتا

ہے گویا اس کا مثبت رول اس کے منفی رول سے کہیں زیادہ ہے۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ بعض مقامات پر ان کے ہاں ڈسپلن کی کمی تھی، یا شاید انھوں نے دوراندیشی اور مصلحت کوشی سے کم کام لیا ہے، یا یہ کہ وہ انتہائی جذباتی اور خودرائے تھے۔ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو اس لیے کہ وہ سیلاب کے پانی کی طرح اپنی روانی کے زور میں تھے۔ اب یہ ڈسپلن، دوراندیشی اور اشتراک رائے کے معاملات تو اس دھرتی پر چھوڑ دیجیے جو سیلاب کے پانی سے سیراب ہوکر اس انتظار میں ہوتی ہے کہ کوئی کُرید کُرید کر اس کی قوتِ نمو کو بیدار کرے، انھی کریدنے والوں میں ڈاکٹر زورؔ بھی تھے۔ ان کے اندر کام کرنے کی طاقت اور لگن تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پاس ایک وژن تھا، ایک بصیرت تھی جسے ہم سماجی شعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سماجی شعور کی جھلکیاں ان کے تمام ادبی کارناموں میں دیکھی جاسکتی ہیں اور شاید یہ بات بھی ان کے سماجی شعور کا ہی ایک حصہ تھی کہ انسان کے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ اور اگر اس کے اندر واقعی سماج کے کسی شعبے میں کوئی موثر رول ادا کرنے کی صلاحیت ہے تو پھر اسے چاہیے کہ بغیر وقت ضائع کیے اپنے کام میں تن دہی سے لگ جائے۔ انسانی سماج آج بہت سے ایسے باصلاحیت لوگوں کی خدمات سے محروم ہے جن کے پاس ڈاکٹر زورؔ جیسا وژن تو شاید ہو لیکن وہ اسپرٹ نہیں۔ چنانچہ اسی اسپرٹ کی بدولت انھوں نے اپنی علمی اور تعلیمی زندگی کے بہت سے مدارج انتہائی میکانکی انداز میں ایک ٹائم باؤنڈ اسکیم کے ساتھ بالکل اسی طرح طے کیے جس طرح مدراس سے چلنے والی وہ جی۔ٹی۔ ایکسپریس طے کیا کرتی تھی، جسے زورؔ صاحب دہلی آنے کے لیے قاضی پیٹ سے پکڑا کرتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے بی۔اے۔ کی تعلیم مکمل کی اور اسی کے ساتھ ہی ان کی کتاب 'روح تنقید' منظر عام پر آگئی۔ ۱۹۲۷ء میں ایم۔اے۔ کیا اور پھر ۱۹۲۹ء میں

لندن یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے لی۔ تین ماہ کے لیے ہندوستان واپس آئے تو اپنی ایک اور مشہور تالیف 'ادبی شہ پارے' مکمل کرگئے۔ یورپ سے واپسی کے فوراً بعد ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو قائم کیا۔

ڈاکٹر زورؔ میں چیزوں کو فوری طور پر سمجھ لینے اور ان کے بارے میں صحیح نتائج اخذ کرلینے کی جو خداداد صلاحیت تھی اسے یقیناً یورپ کے قیام کے دوران اور جلا پانے کا موقع ملا ہوگا۔ چنانچہ اب ان کے ہاں صرف ایک میکانکی انداز ہی نہیں تھا بلکہ ایک سائنٹفک طرز فکر اور ایک سائنٹفک طریقہ کار بھی تھا۔ ان کا تعلق اُردو کے اسکالروں اور پروفیسروں کی اس نسل سے تھا جو خوشامد یا چاپلوسی کے بل پر نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے سہارے اوپر اٹھی تھی۔ زورؔ صاحب نے تاریخ ادب اُردو کے تمام گوشوں پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بہت جلدی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ادبی تاریخ کے کون کون سے گوشے اور کون کون سے موضوعات ایسے ہیں جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں شائع ہونے والی ان کی کتاب 'روح تنقید' اس بات کا نمایاں ثبوت ہے۔ اُردو تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ حالیؔ، شبلیؔ اور محمد حسین آزادؔ سے لے کر زورؔ صاحب کے ہم عصر نقادوں تک اُردو تنقید اپنی تاریخ کی کئی اہم منزلیں طے کرچکی تھی لیکن تنقید کی غرض و غایت اور اس کی تاریخ کو کسی نے ابھی تک باقاعدہ موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔ زورؔ صاحب کی کتاب 'روح تنقید' اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ انھیں مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ اس دور کی مقتدر ادبی ہستیوں نے 'روح تنقید' کا باقاعدہ نوٹس لیا چنانچہ وحیدالدین سلیم، نظم طباطبائی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مرزا رسوا، عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کی بے حد تعریف کی۔ لسانیات کا علم یورپ میں ایک نئے ڈسپلن کے طور پر پوری طرح اپنی

جگہ بنا چکا تھا۔ زبان اور اس کی ماہیت کے بارے میں سسئور، بلوم فیلڈ اور سپیر جیسے لوگوں کے افکار نے انقلاب برپا کر رکھا تھا۔ تاریخی، توضیحی اور ساختی لسانیات کے ذریعے زبان سے متعلق جو نئے نئے تصورات سامنے آئے ان سے ہندوستان کے زیادہ تر لوگ بے خبر تھے۔ زورؔ صاحب ان چند باخبر لوگوں میں سے تھے جو لسانیات کی اہمیت کو سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے لسانیات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ 'روحِ تنقید' کے ساتھ ساتھ ان کے دو کارناموں 'ہندوستانی لسانیات' اور 'ہندوستانی صوتیات' کو بھی اس دور کے تاریخی تقاضوں کے عین مطابق سمجھا جانا چاہیے۔

زورؔ صاحب بنیادی طور پر کوئی تخلیقی فن کار نہیں تھے، اس لیے اُردو کے بہت سے اسکالروں کی طرح انھوں نے شاعری تو تفریحِ طبع کے لیے محض برائے نام ہی کی ہے، ہاں ان کے افسانوں کے کئی مجموعے 'سیر گولکنڈہ'، 'گولکنڈے کے ہیرے' اور 'طلسم تقدیر' وغیرہ ضرور ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ افسانے تخلیقی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ مرقعے ہیں جن کے ذریعے مصنف نے دکن کے قطب شاہی دور کی تاریخ کی بازیافت کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی دور کے ادب کی تفہیم اس کے تاریخی سیاق و سباق کے حوالے سے ممکن ہے۔ زورؔ صاحب نے جب دکنی ادب کی دریافت اور خصوصاً 'کلیات محمد قلی قطب شاہ' کی تدوین کا بیڑا اٹھایا تو انھوں نے اُن تاریخی ذمے داریوں کو بھی محسوس کیا جو اس کام میں ملحوظ رکھنی ضروری تھیں۔ وہ اس کام کے لیے اس اعتبار سے بھی موزوں ترین شخص تھے کہ ان کا تعلق نہ صرف یہ کہ سرزمینِ دکن سے تھا بلکہ وہ اس کی تاریخ میں بھی پوری طرح رچے بسے ہوئے تھے۔ اپنی اس دانش ورانہ فکر کی وجہ سے انھوں نے اپنے ادبی کارناموں میں بھی تاریخی اور سوانحی موضوعات کو زیادہ جگہ دی ہے۔ قطب شاہی عہد کے تہذیبی اور ثقافتی جوہر کو بروئے کار لانے اور محمد قلی قطب شاہ کی

شاعری کی زیریں لہروں تک پہنچنے کے لیے انھوں نے کلیات کے مقدمے میں قطب شاہی عہد کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ شاہانِ گولکنڈہ کے ادبی کارناموں کے ذریعے ان کی تہذیب، ادب اور ثقافت کو سمجھنے اور ان کی تہذیب اور ثقافت کے وسیلے سے ان کے ادبی کارناموں پر نقد و نظر کا یہ عمل ایک بھرپور سماجی شعور کی دلیل ہے۔ اپنے افسانوں کے مجموعے 'گولکنڈے کے ہیرے' کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا:

> ''اس امر کی بے حد ضرورت ہے کہ ہر ممکنہ مواد سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگیاں نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پُرتکلف آرائش اور زیبائش کے علاوہ بازاری اور پست مکانوں میں رہنے سہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہوسکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کیے جائیں جن پر اس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت کا انحصار تھا۔''

ڈاکٹر زورؔ کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا قیام بھی ان کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ وہ تاریخ کے اس مزاج سے واقف تھے کہ کوئی بھی فرد واحد کسی چیز کے استحکام اور دوام کا ضامن نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ فرد فانی ہے اور جماعت جاری اور ساری ہے۔ ڈاکٹر زورؔ اگر صرف اپنی ذات سے ایک انسٹی ٹیوشن تھے تو وہ انسٹی ٹیوشن ۱۹۶۲ء میں دم توڑ چکا لیکن اگر اس انسٹی ٹیوشن کی حدود ان کی ذات سے باہر بھی تھیں اور جو ہیں تو وہ انسٹی ٹیوشن آج بھی زندہ ہے اور آگے بھی رہے گا۔

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی قدرے مختصر عمر میں بہت کام کیا اور سب سے بڑی بات یہ

ہے کہ انھوں نے محض لدّو جانور کی طرح کام کا انبار نہیں لگایا بلکہ انھوں نے ترجیحات سے کام لیتے ہوئے جس کام کی افادیت کو سمجھا اور خود کو اس کے اہل پایا اسے پورا کیا۔

آج ان کے ادبی کارناموں پر اس اعتبار سے بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں ہم کن باتوں کو اپنے پیش نظر رکھیں، ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہییں اور ہمیں کوئی کام کرنے کے لیے کن صلاحیتوں اور کن وسائل کی ضرورت ہے۔ تخلیقی فن کاروں کے مقابلے میں اس طرح کے علمی کام کرنے والے اسکالروں کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ خاصا محدود ہوتا ہے تاہم ڈاکٹر زور کا شمار ادب کی ان معدودے چند ہستیوں میں ہے جنھیں ایک ماڈل کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔

❁❁❁